اسلام میں قرآن

تالیف:

علامہ محمد حسین طباطبائی

ترجمہ:

ڈاکٹر شاہد چوہدری

موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی

تہران ۱۹۸۳ء

مؤسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی

وابستہ بہ

وزارت فرہنگ و آموزش عالی

نام کتاب ـــــ اسلام میں قرآن

سلسلہ نمبر ـــــ ۵۱۷

بار اوّل ـــــ نومبر ۱۹۸۳ء

تعداد ـــــ ۵۰۰۰

مطبع ـــــ ساحل

خطاطی ـــــ خان زمان علوی

حضرت علامہ محمد حسین طباطبائی کی دوسری برسی کے موقع پر جو نومبر ۱۹۸۳ء (ابان) میں منائی جائیگی

موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (سورہ اسریٰ آیہ ۹)

قرآن مجید خدائی قانون ہے جو کہ انسانوں کی دنیاوی اور اخروی سعادت کے لئے نازل ہوا ہے لہٰذا اس پاک کتاب کا مطالعہ اور اس پر عمل کرنا ساری دنیا کے مسلمانوں کی آزادی اور اتحاد کی ضمانت ہے۔ اسی بنا پر "مؤسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی، ایران" قائم کیا گیا جس کے ذمے اسلامی معارف اور ثقافت کی اشاعت اور عظیم قائد حضرت امام خمینی کی رہبری میں اسلامی انقلاب کو روشناس کرانے کے فرائض بھی ہیں، تاکہ جہاں تک ہو سکے مسلمان مفکّروں کے گرانقدر علمی کارناموں کو نہ صرف ایران میں بلکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرے۔

انہی علمی کارناموں میں سے ایک عالم قرآن اور عظیم مفسّر و اسلامی فلاسفر مرحوم علامہ محمد حسین طباطبائی کی گرانقدر اور اہم کتاب "قرآن در اسلام" ہے، جس کا مطالعہ بلاشک وشبہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے بہت ہی ضروری اور فائدہ مند ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ اپنے اردو دان مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں زیادہ مؤثر اور مددگار ثابت ہوگا اور دنیا کے سارے مسلمان خدا کی راہ میں اسلامی علماء کی کوششوں کی حقیقت کو جان سکیں گے۔

مؤسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی

مقدمہ

حضرت علامہ محمد حسین طباطبائی کی دوسری ضخیم کتابوں کے علاوہ ایک بہت ہی مختصر لیکن بہت اہم کتاب "قرآن در اسلام" ہے جس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مختصر اور مفید کتاب "اسلام میں قرآن" کے نام سے ترجمہ کی گئی ہے۔ شاید ہی کسی عالم نے آج تک ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہو۔

اس کتاب کی فہرست پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ایسے مسائل ہیں جو ہر مسلمان کو درپیش ہیں اور ہر شخص قرآن مجید اور اسلام کے بارے میں روزمرّہ ان کو بیان کرتا ہے مگر یہ صرف زبانی حد سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "قرآن مجید انسانی زندگی اور نجات کی ضمانت دیتا ہے" اور سننے والا اس سے سوال کرے کہ کیسے؟ تو شاید وہ شخص جواب میں مکمل قائل کرنے والے دلائل نہ دے سکے۔ اور اسی طرح "قرآن مجید عالمی کتاب ہے" یا "قرآن مجید کامل کتاب ہے" کے بارے میں بھی اگر سوال کیا جائے تو شاید کوئی مدلّل جواب نہ بن پائے، لیکن حضرت علامہ طباطبائی نے ان روزمرہ مسائل کو جس خوبی سے اس کتاب میں بیان فرمایا ہے اور مدلّل تاریخی ثبوت بہم پہنچائے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور ان کو پڑھ کر ہر شخص قرآن مجید کے بارے میں اس قدر واقفیت حاصل کر سکتا ہے جس کی اسے اپنی دنیا سنوارنے کی ضرورت ہے۔

یہ کتاب اس لئے بھی قابل اہمیت ہے کہ بعض جاہل لوگوں کے نزدیک قرآن مجید کامل کتاب نہیں ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید موجودہ مقدار سے زیادہ نازل ہوا تھا لیکن بعض لوگوں نے حضرت رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد اس میں کمی بیشی کر دی ہے اور قرآن مجید جو چالیس پارے تھا اس کو گھٹا کر تیس پارے کر دیا گیا ہے لیکن اس کتاب سے ان کا گمان ختم ہو جائے گا۔

دوسری طرف علامہ موصوف نے قرآن مجید کو لکھنے اور پھر اعراب لگانے اور ان کی نقلیں مختلف ممالک میں بھیجنے کے بارے میں جو لکھا ہے ایسا آج تک کسی نے نہیں لکھا۔ اسی طرح قرآن مجید کی تفسیر اور تاویل کے بارے میں بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی شیعہ اور سنی علماء اور مفسّرین قرآن کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے ان کے طریقۂ کار پر بحث کی ہے۔

تیسری فصل میں علامہ طباطبائی نے وحی کے بارے میں سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے کہ وحی کیا چیز ہے؟ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں اور وحی پیغمبروں کو خدا کا پیغام پہنچاتی تھی اور آج علماء کی نظر میں وحی کی کیا اہمیت ہے، اور کیا وحی کے بغیر کوئی چیز انسان کو خدا کی طرف ہدایت کر سکتی ہے؟ وغیرہ۔ پھر قرآن ہی وہ کتاب ہے جو نازل ہوتے سے لے کر آج تک سینکڑوں علوم کا سرچشمہ بنی اور مختلف علوم آج صرف قرآن سے منسلک ہیں۔

آخر میں آپ نے قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں مفصل بیان کیا ہے کہ قرآن مجید کیسے اور کس طرح نازل ہوا اور کس طریقہ سے اکٹھا کر کے لکھا گیا اور نازل ہونے سے پہلے سورتوں کی تعداد اور ترتیب کیا تھی اور بعد میں جب ایک مصحف میں جمع کیا گیا تو اس کے بعد قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد اور ترتیب کیسے رکھی گئی، اس ضمن میں آپ نے قرآن مجید کی قرأت اور اختلافِ قرأت پر بہت ہی مخصوص انداز میں بیان فرمایا، کیونکہ آج تک اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی قرأت میں بھی اختلاف تھا اور قاریوں کے مختلف طبقے تھے۔ چنانچہ علامہ موصوف یہ فرماتے ہیں کہ نہ صرف قرآن مجید کی ۱۱۴ کی بجائے ۱۱۳ سورتیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض سورتوں کے کئی کئی نام بھی ہیں۔ ان کے علاوہ قاریوں کے پانچ طبقے تھے اور قراءِ سبعہ (سات مشہور قاری) تھے جن کے نام بھی دیئے گئے ہیں اور یہ ان قاریوں سے بالکل الگ ہیں جو حضرت رسول اکرمؐ کے زمانے میں اپنی قرأت کی وجہ سے مشہور تھے یعنی حضرت علیؑ، عثمان، ابی بن کعب، زید بن ثابت، عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعری۔

مختصر یہ کہ اس چھوٹی سی کتاب میں ہر قسم کا تاریخی اور دینی مواد موجود ہے جس کی ایک عام کو ہر روز ضرورت پڑتی ہے اور جس کا جاننا ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے یہی وجہ تھی کہ "موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی" نے اس کتاب کو اردو زبان میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم نے اپنے اردو زبان بھائیوں کو دینی معلومات۔ پہنچانے کیلئے یہ سلسلہ شروع کیا ہے اور "اسلام میں قرآن" اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ انشاءاللہ ہم کوشش کرینگے کہ آئندہ بھی اپنے دینی بھائیوں کی ضروریات کے پیش نظر ایسی مفید علمی اور دینی کتب کے تراجم مختلف زبانوں میں پیش کرتے رہیں اور ہمارے اسلامی انقلاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دینی خدمات انجام دیں۔ امید ہے کہ ہمارے قارئین پوری طرح اس کتاب سے مستفیض ہونگے۔

شاہد چوہدری
موسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی

حالاتِ زندگی

حضرت علامہ محمد حسین طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۰۳ء میں تبریز میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم تبریز میں حاصل کی اور بلیس سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے نجف اشرف چلے گئے۔ آپ کے بچپن کے حالات کے بارے میں یہی کافی ہے کہ آپ پانچ سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ فوت ہوگئیں اور نو سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ ماں باپ کی وفات کے بعد آپ خود اندازہ لگالیں کہ ایک بچے کی زندگی کیسے گزر سکتی ہے۔

علامہ مرحوم نے تبریز میں ادبیات اور علوم شیخ محمد علی سرابی سے پڑھے اور خوش نویسی جناب مرزا علی نقی سے سیکھی۔ نجف اشرف میں آپ اپنے بھائی کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور ان کے اخراجات تبریز کے ایک گاؤں شاد آباد سے آتے تھے جہاں ان کی زمین تھی۔

علامہ مرحوم نجف اشرف سے فارغ التحصیل ہوکر ۱۹۳۵ء میں اپنے آبائی گاؤں شاد آباد آگئے اور اپنی زمین کی دیکھ بھال کرتے اور کاشتکاری میں مشغول ہوگئے تاکہ اپنے لئے مستقل ذریعہ معاش پیدا کرسکیں۔

آپ خود اس بارے میں فرماتے ہیں:۔

"۱۹۳۵ء میں معاشی مشکلات کی وجہ سے مجبوراً اپنے آبائی وطن واپس آیا اور تقریباً دس سال تک وہاں رہا حقیقت یہ ہے کہ میری کے یہ دس سال ضائع ہوگئے کیونکہ کاشتکاری اور معاشرتی مشکلات کی وجہ سے درس و تدریس اور علمی کاموں سے بالکل الگ رہا۔"

دوسری جنگِ عظیم کے ناگوار حوادث، روس کی طرف سے آذربائیجان کے علاقے میں ریشہ دوانیاں اور ڈیموکریٹ پارٹی نے اس صوبے میں جو مصیبتیں پیدا کیں تو حضرت علامہ طباطبائی تنگ آکر درس و تدریس اور تحقیق و تالیف کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑ کر قم چلے آئے۔ قم میں آپ کو بہت شہرت نصیب ہوئی اور یہیں ان کی فلسفہ دانی اور روحانی اقدار کھل کر سامنے آئیں۔ انہوں نے "المیزان" کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر لکھی اور "اصولِ فلسفہ" اور بلیسیوں دوسری کتابیں تالیف کیں۔

قم میں آپکی شہرت صرف ایک معلّم اور استاد کی حیثیت سے نہ تھی بلکہ آپ کی شخصیت ہر شخص اور ہر طبقے کی نظر میں الگ تھی یعنی دینی طلباء سے لے کر یونیورسٹی تک سب لوگ آپ کے معترف تھے۔ آپ نے قرآن مجید کی

تفسیر بالکل نئے انداز میں کی۔ اسی طرح آپ فلسفہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور اس زمانے میں شاید ہی کوئی شخص اسلامی فلسفہ میں آپ کی برابری کر سکتا ہو۔

حضرت علامہ کی شہرت تقریباً تنیس سال کے عرصے میں ایران سے نکل کر دوسرے ملکوں تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ امریکی حکومت نے آپ کو امریکہ آنے اور وہاں اسلامی فلسفہ پڑھانے کی دعوت دی مگر آپ نے قبول نہ کی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد کارل مارکس کا فلسفہ بہت سے ممالک میں پھیل گیا تھا اور ایران کے بعض تعلیم یافتہ افراد بھی اس فلسفہ کی زد میں آگئے تھے اور اس کی تبلیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ کمیونزم ایران میں اپنی جگہ بنا رہا تھا، علامہ طباطبائی نے کمیونزم، مارکسزم، میٹریلزم اور ڈایا لکٹک جیسے فلسفوں کو پڑھ کر ان کے خلاف جہاد کیا اور اسی ضمن میں آپ نے ایک کتاب "اصول فلسفہ و روش ریلزم" اہل مطالعہ و تحقیق کو پیش کی۔

علامہ کے اساتذہ :۔

آپ نے اپنی زندگی اور تعلیمی میدان میں بارہ اساتذہ کرام سے استفادہ کیا جن کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ شیخ مرزا علی سرائی۔
۲۔ آقا مرزا علی نقی۔
۳۔ مرزا محمد حسین نائینی۔
۴۔ شیخ محمد حسین اصفہانی۔
۵۔ سید حسین باد کوبہ ای۔
۶۔ سید ابوالقاسم خوانساری۔
۷۔ سید ابوالحسن اصفہانی۔
۸۔ مرزا علی ایروانی۔
۹۔ مرزا علی اصغر ملکی۔
۱۰۔ آیت اللہ حجت۔
۱۱۔ مرزا علی قاضی۔
۱۲۔ آیت اللہ کمپانی۔

ان سب اساتذہ میں آپ مرزا علی قاضی کی بیحد تعریف کرتے ہیں کیونکہ موصوف نہ صرف بلند پایہ عالم تھے بلکہ تصوف اور روحانیت میں بھی خدا رسیدہ بزرگ تھے جن سے کشف و کرامات بھی ظاہر ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ماہ رمضان کے آخری دنوں میں آپ غائب ہوجاتے تھے اور کسی کو آپکے بارے میں کوئی اطلاع نہ ہوتی تھی۔

تالیفات و تصنیفات :۔

آپ کی ساری زندگی درس و تدریس اور تالیف و تحقیق میں گزری۔ آپ بالکل الگ تھلگ رہتے اور

کبھی فارغ نہ بیٹھتے تھے۔ دن رات آپ کا کام لکھنا پڑھنا ہوتا تھا۔ اور اس کے ساتھ علمی مسائل کا حل تلاش کرتے اور لوگوں کی علمی پیاس بجھاتے میں مشغول رہتے تھے۔ چنانچہ سب سے بڑا کارنامہ جو آپ نے فقہ اور دینی علوم کے بارے میں انجام دیا وہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو "المیزان" کے نام سے ۲۰ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس تفسیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر مسئلے کی تفسیر علم جدید اور جدید فلسفہ کی روشنی میں کی گئی ہے۔

اس تفسیر کے علاوہ آپ نے ۳۱ کتابیں لکھیں جن میں بعض کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔

ایران کے بڑے بڑے علماء میں تقریباً سبھی آپ کے شاگرد ہیں اور شاید بہت کم ایسے ہوں جنہوں نے آپ کے علم سے استفادہ نہ کیا ہو۔ آپ کے خاص شاگرد شہید مرتضیٰ مطہری تھے، جنہوں نے آپ کی کتابوں کی اشاعت پر بھرپور توجہ کی۔

اخلاق :-

آپ کے ایک استاد مرزا علی قاضی تھے جو تصوف و عرفان کی طرف مائل تھے۔ حضرت علامہ نے بھی انہی سے اثر قبول کیا اور آپ عرفان اور اخلاق میں بلند مرتبہ پر پہنچ گئے تھے۔ آپ بہت متواضع و منکسر المزاج تھے یہاں تک کہ آپ کلاس میں شاگردوں کے سامنے کبھی تکیہ لگا کر یا دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ کمرے یا جائے تدریس میں مخصوص شاگردوں کے ساتھ فلسفیانہ اور عارفانہ بحث کرتے تھے لیکن شاگردوں کو اونچی جگہ بٹھاتے اور خود ان سے نیچی جگہ پر بیٹھتے تھے۔ ان میں خاص متانت، وقار، عزتِ نفس، توکل، اخلاص، تواضع، محبت اور شفقت پائی جاتی تھی۔

آپ علوم دینی اور فلسفہ و عرفان میں مکمل مہارت رکھنے کے علاوہ آپ فارسی اور عربی ادبیات میں بھی متبحر عالم تھے۔ آپ کا ذوق لطیف کبھی کبھی آپکو شعر کہنے پر بھی مجبور کر دیتا تھا۔ چنانچہ آپ نے فارسی میں بہت ہی خوبصورت قطعات اور اشعار لکھے ہیں جنکو پڑھ کر انسان آپ کے ذوق کی داد دئیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہمہ یاران بہ سر راہ تو بودیم دلی	غم روی تو مرا دید و مرا تنہا بُرد
ہمہ دلباختہ بودیم و ہراسان کہ غمت	ہمہ را پشت سر انداخت مرا تنہا بُرد

مترجم

فہرست مضامین

باب چہارم

باب پنجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدّمہ

یہ کتاب جو قارئین کرام کے پیشِ نظر ہے، دینِ مقدّس اسلام کی اہم ترین اور بنیادی ترین سند کے بارے میں بیان کرتی ہے۔ اس کتاب میں جس موضوع پر بحث کی گئی ہے، وہ ہے: "عالمِ اسلام میں قرآنِ مجید کی اہمیّت" یعنی قرآنِ مجید کیا ہے؟ یہ کتاب مسلمانوں کے درمیان کیا اہمیّت رکھتی ہے؟ قرآن مجید ایک عالمی اور ابدی کتاب ہے۔ قرآن مجید انسانی فکر کی پیداوار نہیں بلکہ ایک آسمانی وحی ہے۔ قرآن مجید اور دوسرے علوم کا باہمی رابطہ، قرآن کریم کے اوصاف، وغیرہ۔"

درحقیقت ہم یہاں اس کتاب کی اہمیّت کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ اگرچہ دینِ اسلام دوسرے تمام مذاہب کی طرح مختلف اندرونی اختلافات اور گوناگوں فرقوں میں بٹ چکا ہے لیکن تاہم اس مقدس کتاب کی پاکی اور احترام میں کسی مسلمان کو کوئی شک وشبہ نہیں ہے اور اسی طرح اسلام میں ہر قسم کے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے اس کتاب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی بناء پر اس کتاب کے بارے میں بحث کرنے سے ہمارا مقصد قرآن شریف کی اہمیّت کا اس طرح تعارف کرانا ہے جیسا کہ یہ مقدّس کتاب خود بیان کرتی ہے، نہ جیسا کہ اس کے بارے میں ہمارا ایمان یا اعتقاد ہے۔ لہٰذا "حروف اور غرض" کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔

دوسرے الفاظ میں، اگر قرآنِ مجید کے بارے میں کسی اہمیّت یا حالت کے لئے "باوجہ یا بلاوجہ" قائل ہوجائیں اور وہ حالت یا اہمیّت قرآن کریم کے خود اپنے بیان کے مخالف ہو تو ہرگز اس کی کوئی اہمیّت

نہ ہو گی۔ اور اگر کسی مسئلے یا موضوع کے بارے میں قرآن مجید خاموش ہے اور مسلمانوں کے درمیان اس موضوع یا مسئلے کے متعلق اختلافِ نظر موجود ہو تو کسی کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جس کے بارے میں قرآن مجید خود واضح اور صاف صاف بیان کرتا ہو۔

لہٰذا اس بحث اور تحقیق میں ہمیں اس سوال کا جواب دینا چاہئے کہ قرآن مجید خود اس مسئلے کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ نہ اس سوال کا جواب کہ "چونکہ ہم نے اسلامی مذاہب میں سے فلاں مذہب کو قبول کر لیا ہے لہٰذا ہم قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں" (قرآن مجید کے بارے میں ہمارا اپنا کیا نظریہ ہے)

سید محمد حسین طباطبائی

باب اوّل

مسلمانوں کے درمیان قرآن مجید کی کیا اہمیّت ہے؟

الف ۔ قرآن مجید انسانی زندگی کے مجموعی پروگرام کی ضمانت دیتا ہے۔

ب ۔ قرآن مجید نبوت کی سند ہے۔

الف۔ قرآن مجید انسانی زندگی کے مجموعی پروگرام کی ضمانت دیتا ہے۔

چونکہ دینِ اسلام جو ہر دوسرے دین و مذہب سے بڑھ کر انسانی زندگی کی سعادت اور خوشحالی کی ضمانت دیتا ہے، قرآن مجید کے ذریعے ہی مسلمانوں تک پہنچا ہے اسی طرح اسلام کے دینی اصول جو ایمانی، اعتقادی، اخلاقی اور عملی قوانین کی کڑیاں ہیں، ان سب کی بنیاد قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ (سورہ بنی اسرائیل، آیہ ۹) ترجمہ: "اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب قرآن مجید اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے"۔ اور پھر فرماتا ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَىْءٍ (سورہ نحل، آیہ ۸۹) ترجمہ: "اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جو ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرتی ہے اور اس پر روشنی ڈالتی ہے"۔

پس واضح ہے کہ قرآنِ مجید میں دینی عقائد کے اصول، اخلاقی فضائل اور عملی قوانین کا مجموعہ بہت زیادہ آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ ان آیتوں کو یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا مفصل بیان: مندرجہ بالا چند تفصیلات میں غور کرنے کے بعد انسانی زندگی کے پروگراموں پر مبنی جو قرآن مجید میں لکھے ہوئے ہیں، ان کے حقیقی معنی کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسان اپنی زندگی میں کامیابی، خوشحالی اور سعادت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتا (خوشحالی اور سعادت، زندگی کی ایک ایسی صورت ہے کہ انسان ہمیشہ اس کی خواہش اور آرزو رکھتا ہے مثلاً آزادی، فلاح و بہبود اور ذریعۂ معاش میں زیادتی وغیرہ)

اور کبھی کبھی ایسے اشخاص بھی نظر آتے ہیں جو اپنی سعادت اور خوشحالی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مثلاً بعض اوقات ایک شخص خودکشی کر کے اپنی زندگی کو ختم کر لیتا ہے یا زندگی کی دوسری لذتوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے، اگر ایسے اشخاص کی رُوحی حالت پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ یہ لوگ اپنے فکر اور نظریئے کے مطابق خاص وجوہات میں زندگی کی سعادت کو پرکھتے اور جانچتے ہیں اور انہی وجوہات اور عناصر میں سعادت سمجھتے ہیں۔ مثلاً جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ زندگی سختیوں اور مصیبتوں کی وجہ سے اپنے آپ کو موت کے منہ میں تصوّر کرتا ہے اور جو کوئی زہد و ریاضت میں مشغول ہو کر زندگی کی لذتوں کو اپنے لئے حرام کر لیتا ہے وہ اپنے نظریئے اور طریقے میں ہی زندگی کی سعادت کو محسوس کرتا ہے۔

پس ہر انسان اپنی زندگی میں سعادت اور کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے خواہ وہ اپنی حقیقی سعادت کی تشخیص میں ٹھیک ہو یا غلط۔

۲۔ انسانی زندگی کی جدوجہد ہرگز پروگرام کے بغیر عمل میں نہیں آتی، یہ بالکل واضح اور صاف مسئلہ ہے اور اگر کسی وقت یہ مسئلہ انسان کی نظروں سے چھپا رہتا ہے تو وہ بار بار کے تکرار کی وجہ سے ہے، کیونکہ ایک طرف تو انسان اپنی خواہش اور اپنے ارادے کے مطابق کام کرتا ہے اور جب تک موجودہ وجوہات کے مطابق کسی کام کو ضروری نہیں سمجھتا اس کو انجام نہیں دیتا یعنی انسان کسی کام کو اپنے عقل و شعور کے حکم سے ہی کرتا ہے اور جب تک اس کی عقل اور اس کا ضمیر اس کام کی اجازت نہیں دیتے، اس کام کو شروع نہیں کرتا لیکن دوسری طرف جن کاموں کو اپنے لئے انجام دیتا ان سے مقصد اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہوتا ہے، لہٰذا اس کے کردار و افعال میں براہ راست ایک تعلق ہوتا ہے۔

کھانا، پینا، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، جانا، آنا وغیرہ سب کام ایک خاص انداز سے اور موقع محل کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ کہیں یہ کام ضروری ہوتے ہیں اور کہیں غیر ضروری۔ ایک وقت میں مفید اور دوسرے وقت میں

ضرر رساں یا غیر مفید۔ لہٰذا ہر کام اس عقل و فکر اور انسانی شعور کے ذریعے انجام پاتے ہیں جو آدمی میں موجود ہے۔ اسی طرح ہر چھوٹا اور بڑا کام اسی کلی پروگرام کے مطابق کرتا ہے۔

ہر انسان اپنے انفرادی کاموں میں ایک ملک کی مانند ہے جس کے باشندے مخصوص قوانین، رسم و رواج میں زندگی گزارتے ہیں اور اس ملک کی مختار اور حاکم طاقتوں کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنے کردار کو اس ملک کے باشندوں کے مطابق بنائیں اور پھر ان کو نافذ کریں۔

ایک معاشرے کی اجتماعی سرگرمیاں بھی انفرادی سرگرمیوں کی طرح ہوتی ہیں لہٰذا ہمیشہ ایک طرح کے قوانین، آداب و رسوم اور اصول جو اکثریت کے لئے قابلِ قبول ہوں اس معاشرے میں حاکم ہونے چاہئیں، ورنہ معاشرے کے اجزاء افراتفری اور ہرج و مرج کے ذریعے بہت تھوڑی مدت میں درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔

بہرحال اگر معاشرہ مذہبی ہو تو حکومت بھی احکام مذہب کے مطابق ہوگی اور اگر معاشرہ غیر مذہبی اور متمدن ہوگا تو اس معاشرے کی تمام سرگرمیاں قانون کے تحت ہوں گی۔ اگر معاشرہ غیر مذہبی اور غیر مہذب ہوگا تو اس کے لئے مطلق العنان اور آمرانہ حکومت نے جو قانون بنا کر اس پر ٹھونسا ہوگا یا معاشرے میں پیدا ہونے والے رسم و رواج اور قسم قسم کے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔

پس ہر حال میں انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں میں ایک خاص مقصد رکھنے کے لئے ناگزیر ہے، لہٰذا اپنے مقصد کو پانے کے لئے مناسب طریقہ کار اختیار کرنے اور پروگرام کے مطابق کام کرنے سے ہرگز بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید بھی اس نظریئے کی تائید و تصدیق فرماتا ہے: وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (سورہ بقرۃ۔ آیہ ۱۴۸) ترجمہ: "تم میں سے ہر شخص کے لئے ایک خاص مقصد ہے جس کے پیش نظر کام کرتے ہو، پس ہمیشہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کوشش کرو تاکہ اپنے اعلیٰ مقصد کو حاصل کر سکو۔"

بنیادی طور پر قرآن مجید میں "دین" کا مطلب طریقہ زندگی ہے اور مومن و کافر اور حتیٰ کہ وہ لوگ جو خالق (خداوند تعالیٰ) کے مکمل طور پر منکر ہیں وہ بھی "دین" کے بغیر نہیں ہیں کیونکہ انسانی زندگی ایک خاص طریقے کے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتی خواہ وہ طریقہ نبوت اور وحی کی طرف سے ہو یا بناوٹی اور مصنوعی قانون کے مطابق، اللہ تعالیٰ ان ستمگاروں کے بارے میں جو خدائی دین سے دشمنی رکھتے ہیں اور کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں فرماتا ہے: الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ

اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا (سورہ اعراف۔آیہ ۴۵) ترجمہ: "جو خدا کی راہ سے لوگوں کو ہٹاتے اور روکتے ہیں اور اس میں جو فطری زندگی کی راہ ہے (خواہ مخواہ) اس کو توڑ موڑ کر اپنے لئے اپناتے ہیں۔" [1]

۳۔ زندگی کا بہترین اور ہمیشگی طریقہ وہ ہے جس کی طرف انسانی فطرت رہنمائی کرے، نہ وہ کہ جو ایک فرد یا معاشرے کے احساسات سے پیدا ہوا ہو۔ اگر فطرت کے ہر ایک جزء کا گہرا اور بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جزء زندگی کا ایک مقصد اور غرض و غایت لئے ہوئے ہے جو اپنی پیدائش سے لے کر اس خاص مقصد کی طرف متوجہ ہے اور اپنے مقصد کو پانے کے لئے نزدیک ترین اور مناسب ترین راہ کی تلاش میں ہے، یہ جزء اپنے اندرونی اور بیرونی ڈھانچے میں ایک خاص ساز و سامان سے آراستہ ہے جو اس کے حقیقی مقصود اور گوناگوں سرگرمیوں کا سرچشمہ شمار ہوتا ہے۔ ہر جاندار اور بے جان چیز میں فطرت کا یہی رویہ اور طریقہ کار فرما ہے۔

مثلاً گندم کا پودا اپنی پیدائش کے پہلے دن سے ہی، جب وہ مٹی سے اپنی سرسبز اور ہری بھری پتی کے ساتھ دانے سے باہر نکلتا ہے تو وہ (شروع سے ہی) اپنی فطرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک ایسا پودا ہے جس کے کئی خوشے ہیں اور اپنی فطری طاقت کے ساتھ عنصری اجزاء کو زمین اور ہوا سے خاص نسبت سے حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کا حصہ بناتے ہوئے دن بدن بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے اور ہر روز اپنی حالت کو بدلتا ہے، یہاں تک کہ ایک کامل پودا بن جاتا ہے جس کی متعدد شاخیں اور خوشے ہوتے ہیں، پھر اس حالت کو پہنچ کر اپنی رفتار اور ترقی کو روک دیتا ہے۔

ایک اخروٹ کے درخت کا بھی اگر بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اپنی پیدائش کے دن سے لے کر ایک خاص مقصد اور ہدف کی طرف متوجہ ہے یعنی یہ کہ وہ ایک اخروٹ کا درخت ہے جو تومند اور بڑا ہے، لہٰذا اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنے خاص اور مناسب طریقے سے زندگی کی راہ کو طے کرتا ہے اور اسی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتا ہوا اپنے انتہائی مقصد کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ یہ درخت گندم کے پودے کا راستہ اختیار نہیں کرتا جیسا کہ گندم کا پودا بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں اخروٹ کے درخت کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔

---

[1] اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ "سبیل اللہ" قرآن کی معرفت میں "دین" ہے اور یہ آیہ شریفہ واضح کرتی ہے کہ ستمگار اور ظالم لوگ بلکہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے وہ دینِ خدا (فطری دین) کو توڑ موڑ کر نافذ کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے پروگرام اور طریقے کو جو وہ لوگ نافذ کرتے ہیں وہی ان کا دین شمار ہوتا ہے۔

تمام کائنات اور مخلوقات جو اس ظاہری دنیا کو بناتی ہیں، اسی قانون کے تحت عمل کرتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ نوعِ انسان اس قانون اور قاعدے سے مستثنیٰ ہو (انسان اپنی زندگی میں جو مقصد اور غرض و غایت بھی رکھتا ہو اس کی سعادت اسی مقصد کو پانے کے لئے ہے اور وہ اپنے مناسب ساز و سامان کے ساتھ اپنے ہدف تک پہنچنے کی تگ و دو میں مصروف ہے) بلکہ انسانی زندگی کے ساز و سامان کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ بھی دوسری ساری کائنات کی طرح ایک خاص مقصد رکھتا ہے جو اس کی خوش بختی اور سعادت کا ضامن ہے اور اپنے پورے وسائل اور کوشش کے ساتھ اس راہِ سعادت تک پہنچنے کی جد و جہد کرتا ہے۔

لہٰذا جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ خاص انسانی فطرت اور آفرینشِ جہان کے بارے میں ہے کہ انسان بھی اسی کائنات کا اٹوٹ انگ ہے۔ یہی چیز انسان کو اس کی حقیقی سعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی طرح سب سے اہم، پائیدار اور مضبوط قوانین جن پر چلنا ہی انسانی سعادت کی ضمانت ہے، انسان کی راہنمائی کرتے ہیں۔

گزشتہ بحث کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (سورہ طٰہٰ آیہ ۵۰) ترجمہ: "ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز اور ہر مخلوق کو ایک خاص صورت (فطرت) عطا فرمائی، پھر ہر چیز کو سعادت اور خاص مقصد کی طرف رہنمائی کی۔"

پھر فرماتا ہے: اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ○ (سورہ الاعلیٰ، آیہ ۲،۳) ترجمہ: "وہ خدا جس نے مخلوق کے اجزا کو جمع کر کے (دنیا کو) بنایا، اور وہ خدا جس نے ہر چیز کا خاص انداز مقرر کیا، پھر اس کو ہدایت فرمائی۔"

پھر فرماتا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ (سورہ شمس، آیہ ۷-۱۰) خلاصہ ترجمہ: "قسم اپنے نفس کی اور جس نے اس کو پیدا کیا اور پھر اس نے نفس کو بدکاری اور پرہیزگاری کا راستہ بتایا۔ جس شخص نے اپنے نفس کی اچھی طرح پرورش کی اس نے نجات حاصل کی اور جس شخص نے اپنے نفس کو آلودہ کیا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔"

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ (سورہ الروم آیہ ۳۰) ترجمہ: "اپنے

(رخ) آپ کو دین پر استوار کر، پوری توجّہ اور تہ دل سے دین کو قبول کر، لیکن اعتدال پسندی کو اپنا پیشہ بنا اور افراط و تفریط سے پرہیز کر، یہی خدا کی فطرت ہے اور خدا کی فطرت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ دین ہے جو انسانی زندگی کا انتظام کرنے کی طاقت رکھتا ہے (مضبوط اور بالکل سیدھا دین ہے)"

پھر فرماتا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورہ آلِ عمران آیہ ۱۹) ترجمہ: "دین اور زندگی کا طریقہ خدا کے سامنے جھکنے میں ہی ہے۔ اس کے ارادے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں ہے، یعنی اس کی قدرت اور فطرت کے سامنے، جو انسان کو ایک خاص قانون کی طرف دعوت دیتا ہے۔"

اور دوسری جگہ فرماتا ہے: وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (سورہ آلِ عمران آیہ ۸۵) ترجمہ: "جو کوئی دین اسلام کے بغیر یعنی خدا کے ارادے کے بغیر کسی اور دین کی طرف رجوع کرے تو اس کا وہ دین یا طریقہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا۔"

مندرجہ بالا آیات اور ایسی ہی دوسری آیات جو اس مضمون کی مناسبت میں نازل ہوئی ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے خداوند تعالیٰ اپنی ہر مخلوق اور منجملہ انسان کو ایک خاص سعادت اور فطری مقصد کی طرف یعنی اپنی فطرت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے حقیقی اور واقعی راستہ وہی ہے جس کی طرف اس (انسان) کی خاص فطرت دعوت کرتی ہے، لہٰذا انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قوانین پر کاربند رہے کیونکہ ایک حقیقی اور فطری انسان کی طبیعت اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے نہ کہ ایسے انسانوں کو جو ہوا و ہوس اور نفسِ امّارہ سے آلودہ ہوں اور احساسات کے سامنے دست بستہ اسیر ہوں۔

فطری دین کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی وجود کا نظام درہم برہم نہ ہونے پائے اور ہر ایک (جزء) کا حق بخوبی ادا ہو۔ لہٰذا انسانی وجود میں جو مختلف اور متضاد نظام مثلاً گوناگوں احساساتی قوتیں اللہ تعالیٰ نے بخشی ہیں وہ منظّم صورت میں موجود ہیں، یہ سب قوتیں اس حد تک دوسروں کے لئے مزاحمت پیدا نہ کریں، ان کو عمل کا اختیار دیا گیا ہے۔

اور آخر کار انسان کے اندر عقل کی حکومت ہونی چاہیئے نہ کہ خواہشاتِ نفسانی و احساسات و جذبات کا غلبہ، اور معاشرے میں بھی انسانوں کے حق و صلاح پر مبنی حکومت قائم ہو نہ کہ ایک آمر اور ایک طاقتور انسان

کی خواہشات اور ہوا و ہوس کے مطابق اور نہ ہی اکثریت افراد کی خواہشات کے مطابق اگرچہ وہ حکومت ایک جماعت یا گروہ کی صلاح اور حقیقی مصلحت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تشریعی (شرعاً و قانوناً) لحاظ سے حکومت صرف اللہ کی ہے اور اس کے بغیر حکومت کسی اور کا حق نہیں ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری (اقبال)

کہ فرائض، قوانین اور شرعی قوانین بنائے یا تعین کرے، کیونکہ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے صرف وہی قوانین اور قواعد انسانی زندگی کے لئے مفید ہیں جو اس کے لئے فطری طریقے پر معین کئے گئے ہوں یعنی اندرونی اور بیرونی عناصر وعوامل اور علل انسان کو ان فرائض کی انجام دہی کی دعوت کریں اور اس کو مجبور کریں مثلاً ان کے انجام دینے میں خدا کا حکم شامل ہو، کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس کام کو چاہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو انجام دینے کی تمام شرائط اور وجوہات کو پہلے سے پیدا کیا ہے، لیکن کبھی کبھی یہ وجوہات اور شرائط ایسی ہیں کہ کسی چیز کی جبری پیدائش کا موجب اور سبب بن جاتی ہیں، جیسے روزانہ قدرتی حوادث کا وجود میں آنا اور اس صورت میں اس خدائی ارادے کو "تکوینی ارادہ" کہتے ہیں اور کبھی یہ وجوہات و شرائط اس قسم کی ہیں کہ انسان اپنے عمل کو اختیار اور آزادی کے ساتھ انجام دیتا ہے جیسے کھانا، پینا وغیرہ۔ اور اس صورت میں اس عمل کو "تشریعی ارادہ" کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں یُوں فرماتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (سورہ یوسف آیہ ۴۰، ۶۷) ترجمہ: "خدا کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور حکومت صرف اللہ ہی کے واسطے ہے"۔

اس مقدمہ کے واضح ہو جانے کے بعد جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید ان تین مقدموں کے پیش نظر کہ انسان اپنی زندگی میں ایک خاص مقصد اور غرض و غایت رکھتا ہے (یعنی زندگی کی سعادت) جس کو اپنی پوری زندگی میں حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کرتا ہے اور یہ کوشش بغیر کسی پروگرام کے نتیجہ بخش نہیں ہوگی، لہٰذا اس پروگرام کو بھی خدا کی کتاب فطرت آفرینش میں ہی پڑھنا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو خدائی تعلیم کے ذریعے ہی کھا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید نے ان مقدمات کے پیش نظر انسانی زندگی کے پروگرام کی بنیاد اس طرح رکھی ہے:۔

قرآن مجید نے اپنے پروگرام کی بنیاد "خدا شناسی" پر رکھی ہے اور اسی طرح "ماسوا اللہ" سے بیگانگی کو

شناختِ دین کی اوّلین بنیاد قرار دیا ہے۔ اس طرح خدا کو پہچاننے کے بعد "معاد شناسی" (روزِ قیامت پر اعتقاد جس دن انسان کے اچھے برے کاموں کا بدلہ اور عوضانہ دیا جائے گا) کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور اس کو ایک دوسرا اصول بتایا۔ اس کے بعد معاد شناسی سے پیغمبر شناسی کا نتیجہ حاصل کیا، کیونکہ اچھے اور برے کاموں کا بدلہ، وحی اور نبوت کے ذریعے اطاعت، گناہ، نیک و بد کاموں کے بارے میں پہلے سے بیان شدہ اطلاع کے بغیر نہیں دیا جا سکتا، جس کے بارے میں آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے۔

اس مسئلے کو بھی ایک الگ اصول بیان فرمایا۔ مندرجہ بالا تین اصولوں یعنی ماسوا اللہ کی نفی پر ایمان، نبوت پر اعتقاد اور معاد پر ایمان کو دینِ اسلام کے اصول کہا ہے۔

اس کے بعد دوسرے درجہ پر اخلاقِ پسندیدہ اور نیک صفات جو پہلے تین اصولوں کے مناسب ہوں اور ایک حقیقت پسند اور با ایمان انسان کو ان صفات حمیدہ سے متصف اور آراستہ ہونا چاہئے، بیان فرمایا۔ پھر عملی قوانین جو دراصل حقیقی سعادت کے ضامن اور اخلاق پسندیدہ کو جنم دے کر پرورش دیتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر حق و حقیقت پر مبنی اعتقادات اور بنیادی اصولوں کو ترقی و نشوونما دیتے ہیں، ان کی بنیاد ڈالی اور انکے بارے میں وضاحت فرمائی۔

کیونکہ جو شخص جنسی مسائل یا چوری، خیانت، خرد برد اور دھوکے بازی میں ہر چیز کو جائز سمجھتا ہے اس سے کسی قسم کی پاکِ نفس جیسی صفات کی ہرگز توقع نہیں رکھی جا سکتی یا جو شخص مال و دولت جمع کرنے کا شائق اور شیفتہ ہے اور لوگوں کے مالی حقوق اور قرضوں کی ادائیگی کی طرف ہرگز توجہ نہیں کرتا وہ کبھی سخاوت کی صفت سے متصف نہیں ہو سکتا یا جو شخص خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا اور ہفتوں بلکہ مہینوں تک خدا کی یاد سے غافل رہتا ہے وہ کبھی خدا اور روزِ قیامت پر ایمان اور ایسے ہی ایک عابد کی صفات رکھنے سے قاصر ہے۔

پس پسندیدہ اخلاق، مناسب اعمال و افعال کے سلسلے ہی سے زندہ رہتے ہیں۔ چنانچہ پسندیدہ اخلاق، بنیادی اعتقادات کی نسبت یہی حالت رکھتے ہیں۔ مثلاً جو شخص کبر و غرور، خود غرضی اور خود پسندی کے سوا کچھ نہیں جانتا تو اس سے خدا پر اعتقاد اور مقامِ ربوبیت کے سامنے خضوع و خشوع کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ جو شخص تمام عمر انصاف و مروت اور رحم و شفقت اور مہربانی کے معنی سے بے خبر ہے وہ ہرگز روزِ قیامت میں سوال و جواب پر ایمان نہیں رکھ سکتا۔

خداوند تعالیٰ حقانی اعتقادات اور پسندیدہ اخلاق کے سلسلے میں خود ایمان اور اعتقاد سے وابستہ ہیں، اس

طرح فرماتا ہے : اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (سورہ فاطر۔ آیہ ۱۰)
ترجمہ : "خدا تعالیٰ پر پختہ اور پاک ایمان ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور اچھے کاموں کو وہ خود بلند فرماتا ہے یعنی اعتقادات کو زیادہ کرنے میں مدد کرتا ہے۔

اور خصوصاً عمل پر اعتقاد کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے : ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰی اَنْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَکَانُوْا بِھَا یَسْتَھْزِءُوْنَ (سورہ الروم آیہ ۱۰)
ترجمہ : "اس کے بعد آخر کار جو لوگ بُرے کام کرتے تھے ان کا کام یہاں تک آپہنچا کہ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کے ساتھ مسخرہ پن کرتے تھے۔"

مختصر یہ کہ قرآن مجید حقیقی اسلام کی بنیادوں کو کلّی طور پر مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے :۔

۱۔ اسلامی اصول و عقائد جن میں دین کے تین اصول شامل ہیں : یعنی توحید، نبوت اور معاد (قیامت) اور اس قسم کے دوسرے فرعی عقائد مثلاً لوح، قلم، قضا، قدر، ملائکہ، عرش، کرسی اور آسمان و زمین کی پیدائش وغیرہ۔

۲۔ پسندیدہ اخلاق۔

۳۔ شرعی احکام اور عملی قوانین جن کے متعلق قرآن مجید نے کلّی طور پر بیان فرمایا ہے اور ان کی تفصیلات اور جزئیات کو پیغمبر اکرمؐ کے بیانات یا توضیحات پر چھوڑ دیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی "حدیث ثقلین" کے مطابق جس پر تمام اسلامی فرقے متفق ہیں اور مسلسل ان احادیث کو نقل کرتے رہے ہیں، اہلبیتؑ کو اپنا جانشین فرمایا ہے۔[۱]

ب۔ قرآن مجید نبوّت کی سند ہے

قرآن مجید جگہ جگہ وضاحت سے بیان فرماتا ہے کہ یہ (قرآن) خدا کا کلام ہے یعنی یہ کتاب انہی موجودہ الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی انہی الفاظ میں اس کو بیان فرمایا ہے۔

اس معنی کو ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اور ایک انسان کا کلام نہیں، بار بار بہت زیادہ آیات

---

[۱] دیکھئے عبقات، جلد حدیث ثقلین۔ اس کتاب میں مذکورہ حدیث کو سینکڑوں بار خاص اور عام طریقوں پر نقل کیا ہے۔

شریفہ میں اس موضوع پر زور دیا گیا ہے اور قرآن مجید کو ہر لحاظ سے ایک معجزہ کہا گیا ہے جو انسانی طاقت اور توانائی سے بہت بالا و برتر ہے۔

جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ۝ (سورہ طور آیہ ۳۳، ۳۴) ترجمہ: "یا کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے خود قرآن کو بنا (گھڑ) کر اسے خدا سے منسوب کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ پس اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو اس (قرآن) کی طرح عبارت کا نمونہ لائیں (بنائیں)"۔

اور پھر فرماتا ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝ (سورہ بنی اسرائیل/اسریٰ، آیہ ۸۸) ترجمہ: "اے رسولؐ کہہ دو کہ اگر (سارے جہان کے) آدمی اور جن اس بات پر اکھٹے اور متفق ہوں کہ قرآن کا مثل لے آئیں تو (ناممکن) اس کے برابر نہیں لا سکتے اگرچہ (اس کوشش میں) وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں"۔

اور پھر فرمایا: اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ (سورہ ہود آیہ ۱۳) ترجمہ: "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (تم) نے اس (قرآن) کو اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسی ہی دس سورتیں اپنی طرف سے گھڑ کے لے آؤ"۔

اور پھر فرماتا ہے: اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ (سورہ یونس آیہ ۳۸) ترجمہ: "آیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو رسول نے خود جھوٹ موٹ بنا کر خدا سے منسوب کر لیا ہے۔ پس اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ اس کی مانند صرف ایک ہی سورت لکھ کر لے آؤ"۔

اور پھر (ان لوگوں کا) پیغمبر اکرمؐ سے مقابلہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (سورۃ البقرہ آیہ ۲۳) ترجمہ: "اور جو چیز (قرآن) ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے اگر تمہیں اس میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے تو ایسے انسان کی طرح جو لکھا پڑھا نہیں اور جاہلیت کے ماحول میں اس کی نشو و نما ہوئی ہے، اس طرح کی ایک قرآنی سورت لکھ کر لاؤ"۔

اور پھر اختلاف اور تضاد نہ رکھنے کے متعلق برابری اور مقابلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ

الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (سورہ النساء آیہ ۸۲)

ترجمہ: "آیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن خدا کے بغیر کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلافات پیدا کرتے کیونکہ اس دنیا میں ہر چیز تغیر اور ترقی پذیری کے قانون میں شامل ہے اور وہ اختلاف اجزاء اور احوال سے مبرا نہیں ہوتی اور اگر قرآن انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو جیسا کہ تیئس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا تو یہ (قرآن) اختلافات اور تضادات سے مبرا نہیں ہو سکتا تھا اور اس طرح ہرگز یکساں نہ ہوتا۔"

قرآن مجید جو ان فیصلہ کن اور پختہ انداز سے خدا کا کلام ہونے کا اعلان اور اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک صاف طور پر حضرت محمدؐ کا اپنے رسول اور پیغمبر کے طور پر تعارف کراتا ہے اور اسی طرح آنحضرتؐ کی نبوت کی سند لکھتا ہے۔ اسی بنا پر کئی بار خدا کے کلام میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی نبوت اور پیغمبری کے ثبوت میں خدا کی شہادت یعنی قرآن مجید کی رو سے اپنی نبوت کا اعلان کرے: قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ (سورہ رعد آیہ ۴۳) ترجمہ: "اے نبیؐ کہدے کہ میرے اور تمہارے درمیان، میری نبوت اور پیغمبری کے متعلق خود خدا کی شہادت کافی ہے۔"

ایک اور جگہ (قرآن مجید) میں خداوند کریم کی شہادت کے علاوہ فرشتوں کی شہادت بھی ہے: لَٰكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ ۖ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُونَ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا (سورہ نساء آیہ ۱۶۶) ترجمہ: "لیکن خداوند تعالیٰ نے جو چیز تجھ پر نازل کی ہے اس کے متعلق خود بھی شہادت دیتا ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں اور صرف خداوند تعالیٰ کی شہادت کافی ہے۔"

باب دوم

قرآن مجید کی تعلیم کے متعلق

۱۔ قرآن مجید ایک عالمی کتاب ہے۔

۲۔ قرآن مجید ایک کامل اور مکمل کتاب۔

۳۔ قرآن مجید ابدی اور ہمیشگی کتاب ہے۔

۴۔ قرآن مجید اپنا آپ ثبوت ہے۔

۵۔ قرآن مجید دو پہلو رکھتا ہے، یعنی ظاہری اور باطنی پہلو۔

۶۔ قرآن مجید نے کیوں ظاہری اور باطنی دو طریقوں سے بیان کیا ہے؟

۷۔ قرآن مجید کے احکام محکم اور متشابہ ہیں۔

۸۔ اسلامی مفسّرین اور علماء کی نظر میں محکم اور متشابہ کے کیا معنی ہیں؟

۹۔ قرآن مجید کے محکم اور متشابہ میں اہلبیتؑ کے طریقے۔

۱۰۔ قرآن مجید میں تاویل اور تنزیل موجود ہے۔

۱۱۔ مفسرین اور علماء کی نظر میں تاویل کے معنی۔

۱۲۔ قرآن مجید کی رُو سے تاویل کے حقیقی معنی کیا ہیں؟

۱۳۔ قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ موجود ہے۔

۱۴۔ قرآن مجید میں "جری" اور "انطباق"۔

۱۵۔ قرآن مجید کی تفسیر، اس کی پیدائش اور ترقی۔

۱ ــــ قرآن مجید ایک عالمی کتاب ہے

قرآنِ مجید اپنے مطالب میں امتوں میں سے ایک خاص امت مثلاً امتِ عرب یا قبیلوں میں ایک خاص قبیلے یا گروہ یعنی مسلمانوں سے ہی مختص نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید غیر مسلم گروہوں سے بھی اسی طرح بحث کرتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کو حکم دیتا ہے۔ قرآن مجید اپنے بہت زیادہ خطبوں میں کفّار، مشرکین، اہلِ کتاب، یہودیوں، عیسائیوں اور بنی اسرائیل کے بارے میں بحث کرتا ہے اور ان گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے انکو شناخت حقیقی کیطرف دعوت دیتا ہے۔

اس طرح قرآنِ مجید ان گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کے ساتھ احتجاج کرتا ہے اور ان کو دعوت دیتا ہے اور اپنے خطاب کو ان کے عرب ہوتے پر مختص اور محدود نہیں کرتا چنانچہ مشرکوں اور بت پرستوں کے بارے میں فرماتا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (سورہ توبہ آیہ ۱۱)

ترجمہ: "پس اگر انہوں نے توبہ کر لی اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں"۔

اور اہلِ کتاب کے بارے میں یعنی یہودی، عیسائی اور مجوسی جو اہلِ کتاب میں شمار ہوتے ہیں فرمایا: قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورہ آل عمران آیہ ۶۴)

ترجمہ: "اے نبی کہدو کہ اہلِ کتاب خدا کے کلام کی طرف لوٹ آئیں، کہ ہمارے اور تمہارے درمیان مساوی طور پر قبول ہو جائے (مساوی طور پر خدا کے کلام کو قبول کر لیں) اور یہ وہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں

اور نہ ہی اس کا شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے بعض لوگ دوسری چیزوں کو اپنا خدا نہ بنائیں"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہرگز یوں نہیں فرمایا: "کہ مشرکین عرب تو یہ کرلیں"۔ اور نہ ہی فرمایا کہ: "اہل کتاب جو عربی نسل سے تعلق رکھتے ہو"۔ ہاں طلوعِ اسلام کے آغاز میں جب کہ یہ دعوت جزیرۃ العرب سے باہر نہیں پھیلی تھی تو فطری طور پر قرآنی خطابات امتِ عرب ہی سے منسوب کئے جاتے تھے، لیکن ہجرت کے چھ سال بعد جب یہ دعوت تمام برِ عظیم عرب میں پھیل گئی تو اس وقت یہ خیال باطل ہوگیا۔

ان آیات کے علاوہ دوسری آیات بھی ہیں جو عوام کو دعوت اسلام دیتی ہیں مثلاً آیۂ کریمہ: وَاُوحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط (سورہ انعام آیۂ ۱۹) ترجمہ: "(یہ قرآن) مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے، اس لئے کہ تم کو نصیحت کروں اور ڈراؤں ان لوگوں کو جو اس نصیحت اور قرآن پر ایمان رکھتے ہیں"۔

اور آیۂ کریمہ: وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ (سورہ القلم آیۂ ۵۲) اور آیۂ شریفہ: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورہ ص آیہ ۸۷) ترجمہ: "یہ قرآن دنیا والوں کیلئے نصیحت اور یاد دہانی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے"۔

اور آیہ کریمہ: اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ○ نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ ○ (سورہ المدثر آیہ ۳۵-۳۶) ترجمہ: "بیشک یہ آیت بزرگ ترین آیات میں سے ہے جبکہ انسان کو خدا سے ڈراتی ہے"۔

تاریخی لحاظ سے بھی اسلام مختلف مذاہب مثلاً بت پرستوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ایسے ہی بعض دوسری امتوں کے افراد مثلاً سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی جیسی شخصیتوں کے ذریعے بھی ثابت ہوچکا ہے۔

۲ــــ قرآن مجید ایک کامل اور مکمل کتاب ہے

قرآن مجید مکمل اور کامل کتاب ہے جو انسانی مقاصد پر مشتمل ہے اور اس مقصد کو کامل ترین صورت میں بیان کرتا ہے، کیونکہ انسانی مقاصد جو حقیقت پسندی سے لبریز ہیں، مکمل جہاں بینی، اخلاقی اصول اور عملی قوانین کو بروئے کار لانے پر مشتمل ہیں جو جہاں بینی کے لئے ضروری اور لازمی ہیں، اللہ تبارک تعالیٰ اس کی تعریف میں فرماتا ہے: یَهْدِیْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ (سورہ احقاف آیہ ۳۰) ترجمہ: "قرآن مجید، اعتقاد اور ایمان کی حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور عمل میں صراطِ مستقیم (راہ راست) کی طرف"۔ پھر ایک اور جگہ انجیل اور تورات کے ذکر کے فرماتا ہے

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ۔ (سورہ مائدہ آیہ ۴۸) ترجمہ: "ہم نے تم پر بھی برحق کتاب نازل کی کہ جو (اس سے پہلے) اس کے وقت میں موجود ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان بھی ہے"۔

اور پھر قرآن مجید کو گزشتہ پیغمبروں اور انبیاء کی شریعتوں سے مقابلہ کرتے ہوتے فرمایا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰٓى (سورہ شوریٰ آیہ ۱۳) ترجمہ: "اس (محمدؐ) نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ اور راستہ مقرر کیا ہے جس (پر چلنے) کا نوحؑ کو حکم دیا گیا تھا اور (اے رسولؐ) اس کی ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی ہے اور اسی کا ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی حکم دیا گیا"۔

اور پھر جامع طور پر فرماتا ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (سورہ نحل آیہ ۸۹) ترجمہ: "ہم نے یہ کتاب آہستہ آہستہ اور بتدریج تم پر نازل کی ہے اور یہ کتاب ہر چیز کو (وضاحت سے) بیان کرتی ہے"۔

مندرجہ بالا آیات کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید دراصل تمام الہامی اور آسمانی کتابوں کے مقاصد پر مشتمل ہے بلکہ ان سے زیادہ (موضوعات اس میں آئے ہیں) اور حقیقت میں ہر وہ چیز کہ انسان اپنی سعادت اور خوش قسمتی کی راہ طے کرنے میں اس پر ایمان، اعتقاد اور عمل کرتا ہے اور اس چیز کا محتاج ہے، اس کتاب میں مکمل اور کامل طور پر بیان کیا گیا ہے۔

۳ —— قرآن مجید ہمیشگی اور ابدی کتاب ہے

گزشتہ باب میں اس موضوع پر ہم نے جو بحث کی ہے وہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ وہ بیان جو ایک مقصد اور مطلب کے بارے میں مکمل اور مطلق ہے، اعتبار اور درستی کے لحاظ سے ایک خاص زمانے میں محدود نہیں ہو سکتا اور قرآن مجید اپنے بیان کو مکمل اور مطلق جانتا ہے اور کمال سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (سورہ طارق آیہ ۱۳-۱۴) ترجمہ: "قرآن ایک قاطع بیان ہے جو حق اور باطل کو آپس میں جدا کرتا ہے اور اس میں بیہودہ بات اور یاوہ گوئی ہرگز نہیں ہے"۔

اسی طرح ایمانی اور اعتقادی علوم بھی، پاک حقیقت اور مکمل واقعیت ہوتے ہیں اور اخلاقی اصول اور عملی قوانین جو اوپر بیان کئے گئے ہیں انہی مستقل حقائق کے نتیجے کی پیداوار ہیں اور اس لئے یہ چیز زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ

نہ تو مٹ سکتی ہے اور نہ ہی منسوخ کی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (سورہ بنی اسرائیل آیہ ۱۰۵) ترجمہ : "ہم نے قرآن مجید کو حق (ٹھیک) نازل کیا اور یہ بھی بالکل حق (ٹھیک) نازل ہوا ہے (یعنی اپنی حدوث و بقاء میں حق سے الگ نہیں ہوا) اور پھر فرماتا ہے : فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ (سورہ یونس آیہ ۳۲) ترجمہ : "آیا حق کے علاوہ (بغیر) گمراہی اور ضلالت کے سوا کوئی اور چیز موجود ہے؟ یعنی حق کو چھوڑنے کے بعد سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں رہتا۔"

ایک اور جگہ اپنے کلام پاک میں تفصیل سے فرماتا ہے : وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سورہ حم سجدہ آیہ ۴۲) ترجمہ : "حقیقت میں قرآن بہت ہی عزیز کتاب ہے جو تمام اطراف سے محفوظ رکھنے والی کتاب ہے یعنی ہر ظلم اور حملے کو اپنی طاقت سے دفع کرتی ہے، باطل نہ سامنے سے اور نہ ہی پیچھے سے اس پر حملہ کر سکتا ہے یعنی نہ اس وقت اور نہ ہی آئندہ منسوخ ہونے والی کتاب نہیں ہے۔"

البتہ احکام قرآنی کی ہدایت کے بارے میں بہت سی بحثیں کی جا چکی ہیں اور ہو سکتی ہیں لیکن اس موضوع سے خارج ہیں کیونکہ یہاں ہمارا مقصد صرف "مسلمانوں کے سامنے قرآن مجید کی اہمیت اور وقعت کو پہچنوانا ہے جیسا کہ خود قرآن (اپنے بارے میں) بیان فرماتا ہے۔

۴ ـــــ قرآن مجید اپنا آپ ثبوت ہے

قرآن مجید جو کہ پختہ کلام ہے، تمام معمولی باتوں کی طرح اپنے معنی سے مراد دریافت کرتا ہے اور ہرگز اپنے بیان اور ثبوت میں مبہم نہیں ہے ظاہری دلیل کی رو سے بھی قرآن مجید کے تحت اللفظی معنی اس کے عربی الفاظ سے مطابقت رکھتے ہیں اور قابل فہمائش ہیں۔

لیکن یہ دعویٰ کہ خود قرآن اپنے ثبوت اور بیان میں مبہم نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص بھی لغات سے واقفیت رکھتا ہو، آیات کریمہ کے معنی اور فقرات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اسی طرح جیسا کہ عربی زبان اور کلام کے معنی سمجھ لیتا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن میں بہت سی ایسی آیات دیکھنے میں آتی ہیں کہ ان میں ایک خاص گروہ اور جماعت مثلاً بنی اسرائیل

مومنین، کفّار اور کبھی عام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے بیانات اور مقاصد کو ان کے سامنے رکھتا ہے (ان سے مخاطب ہوتا ہے[۱]) یا ان سے احتجاج کرتا ہے اور فیصلہ کن انداز میں ان سے کہتا ہے کہ اگر انہیں کسی قسم کا شک وشبہ ہے کہ قرآن مجید خدا کا کلام نہیں ہے تو اس کی مانند (آیات) بنا کر یا لکھ کر لائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ الفاظ یا کلام جو عام انسانوں کے لئے قابلِ فہم نہ ہوگا وہ بے معنی ہے اور اسی طرح اگر انسان ایسی چیز یا کلام لائیں جس کے معانی قابلِ فہمائش نہ ہوں تو وہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (سورہ محمدؐ آیہ ۲۴) ترجمہ: "کیا قرآن میں غور نہیں کرتے اور اس کی آیتوں پر غور و خوض نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔" اور پھر فرماتا ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (سورہ نساء آیہ ۸۲) ترجمہ: "بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کا (کلام) ہوتا تو اس میں (بہت سا) اختلاف پاتے۔"

ان آیات کی رو سے قرآن مجید تدبّر کو جو کہ فہم کی خاصیت رکھتا ہے قبول کرتا ہے اور اسی طرح یہی تدبّر، آیات میں اختلافات، جو ابتدائی اور سطحی طور پر سامنے آتے ہیں وضاحت سے حل کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر ان آیات کے معنی واضح نہ ہوتے تو ان میں تدبّر اور غور اور اسی طرح ظاہری اختلافات غور و فکر کے ذریعہ حل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

لیکن قرآن کی ظاہری حجّت کی نفی کے بارے میں دلیل بے معنی ہے کیونکہ اس قسم کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ صرف یہ کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قرآن مجید کے معانی سمجھنے کے لئے فقط پیغمبر اکرمؐ کی احادیث و بیانات اور یا اہلِ بیتؑ کے بیانات کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

لیکن یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلِ بیتؑ کے بیانات کا ثبوت تو قرآن سے حاصل کرنا چاہئے۔ بنابریں کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کے ثبوت میں ان افراد کے بیانات کافی ہوں، بلکہ رسالت اور امامت کو ثابت کرنے کے لئے قرآن شریف کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو نبوّت کی سند ہے۔

---

[۱] مثال کے طور پر یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا، یٰۤاَهْلَ الْکِتَابِ، یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ، یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ وغیرہ ایسی بے شمار آیتیں موجود ہیں۔

البتہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہل بیتؑ احکام شریعت کی تفصیلات اور اسلامی قوانین کی جزئیات بیان کرنے کے عہدہ دار نہیں جو ظاہری طور پر قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتے (جن امور کی وضاحت کی ضرورت ہے)

اور اسی طرح یہی افراد قرآن کی تعلیم دینے والے معلّم ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ثابت ہوتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورہ نحل ۴۴)

ترجمہ: اور ہم نے تجھ پر ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ یہ چیز جو تجھ پر نازل کی ہے (احکام) اس کو لوگوں کے سامنے بیان اور وضاحت کرو۔

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (سورہ حشر ۷)

ترجمہ: جو چیز پیغمبر اکرمؐ تمہارے لئے لائے ہیں یعنی جس چیز کا انہوں نے حکم دیا ہے اس کو مانو اور قبول کرو اور جس چیز سے انہوں نے منع کیا ہے اس سے باز رہو۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (سورہ نساء - ۶۴)

ترجمہ: ہم نے کسی بھی پیغمبرؐ کو نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ خدا کے حکم کی اطاعت کریں۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ (سورہ جمعہ - ۲)

ترجمہ: خدا وہ ہے جس نے ان پڑھ (اُمّی) جماعت میں سے ایک پیغمبر کو پیدا کیا جو خدا کی آیتوں کو ان کے لئے تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب (قرآن) اور حکمت (علم و دانش) کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات کے بموجب پیغمبر اکرمؐ شریعت کی تفصیلات اور جزئیات کی وضاحت کرتا ہے اور قرآن مجید کا خدائی معلّم ہے اور "حدیث متواتر ثقلین" کے مطابق پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہل بیتؑ کو خداوند تعالیٰ نے مختلف عہدوں پر اپنا نائب اور اپنا جانشین بنایا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ دوسرے افراد جنہوں نے حقیقی معلّموں اور استادوں سے قرآن مجید کے معانی کو سیکھا ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں کے ظاہری معانی کو نہیں سمجھ سکتے۔

قرآن ظاہری اور باطنی پہلو رکھتا ہے

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوا بِہٖ شَیْئًا۔ (سورہ نساء ۳۶)

ترجمہ: صرف خدا کی پرستش اور عبادت کرو اور اس کے علاوہ کسی چیز کو عبادت میں اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

ظاہری طور پر اس آیت کا مطلب معمولی بتوں کی پرستش سے منع کرنا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (سورہ حج ۳۰)

ترجمہ: ناپاکیوں سے پرہیز کرو، جو بت ہیں (یعنی بت پلید ہیں اور ان کی عبادت سے پرہیز کرو)

لیکن بغور مطالعہ اور تجزیہ و تحلیل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کی پوجا اس لئے ممنوع ہے کہ اس کا انتہائی مقصد ماسوا اللہ کے سامنے اپنا سر جھکانا اور خضوع و خشوع کرنا ہے اور معبود کا بت ہونا کوئی خصوصیت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ شیطان کو اس کی عبادت کہتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ (یٰس ۶۰)

ترجمہ: آیا میں نے تمہیں حکم نہیں دیا کہ شیطان کی پرستش نہ کرو اے بنی آدم۔

ایک اور تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری میں خود انسان اور دوسروں (غیروں) کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ ماسوا اللہ کی عبادت اور اطاعت نہیں کرنی چاہئے، ایسے ہی خدا تعالیٰ کے مقابلے میں خواہشاتِ نفسانی کی پیروی بھی نہیں کرنی چاہئے جیسا کہ خدا تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے:

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (سورہ جاثیہ ۲۳)

ترجمہ: آیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے کہ (اس نے) اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا خدا بنایا ہوا ہے۔

ایک اور بغور مطالعے اور تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر بالکل کسی اور چیز کی طرف توجہ ہی نہیں کرنی چاہئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ سے انسان غافل ہو جائے کیونکہ ماسوا اللہ کی طرف توجہ کا مطلب اس چیز کو مستقل (خدا سے الگ) جاننا ہے اور اس کے سامنے ایک قسم کی نرمی اور خضوع و خشوع ظاہر کرنا ہے اور یہی امر عبادت اور پرستش کی روح یا بنیاد ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ یہاں تک کہ فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (سورہ اعراف ۱۷۹)

ترجمہ: قسم کھاتا ہوں کہ ہم نے بہت زیادہ جنّوں اور انسانوں کو جہنّم کیلئے پیدا کیا ہے یہاں تک کہ فرماتا ہے: وہ ہمیشہ خدا سے غافل ہیں۔

جیسا کہ اس آیۂ کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ بتوں کی پوجا نہیں کرنی چاہئے لیکن اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے فرمان کے بغیر کسی اور کی پرستش اور عبادت نہ کرے اور پھر اگر زیادہ غور و خوض کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان حتیٰ کہ اپنی مرضی سے بھی کسی کی اطاعت اور پیروی نہ کرے۔ اس سے اور آگے بڑھیں تو یہ حاصل ہوگا کہ خداوند تعالیٰ سے غفلت اور ماسوا اللہ کی طرف توجہ ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔

اسی طرح اوّل تو ایک آیت کے سادہ اور ابتدائی معنی ظاہر ہوتے ہیں پھر (ان پر غور کرنے سے) وسیع معنی نظر آتے ہیں اور ان وسیع معنوں کے اندر دوسرے وسیع معنی پوشیدہ ہوتے ہیں جو پورے قرآن میں جاری ہیں اور انہی معنوں میں غور و فکر کے بعد پیغمبر اکرمؐ کی مشہور و معروف حدیث شریف جو بہت زیادہ کتب احادیث و تفاسیر میں نقل ہے کے معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی اِنَّ لِلْقُرْاٰنِ ظَهْرًا وَّبَطْنًا وَلِبَطْنِهٖ بَطْنًا اِلٰى سَبْعَةِ اَبْطُنٍ۔

ترجمہ:

(تفسیر صافی مقدمہ ۸ اور سفینۃ البحار مادۂ البطن)

لہٰذا جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی پہلو (یا ظہر و بطن) کہ یہ دونوں پہلو کلام (قرآن) مجید کے مطابق اور اس سے ملتے ہیں، سوائے اس کے کہ یہ دونوں معنے طول کے لحاظ سے ہم معنی اور ہم مراد ہیں نہ عرض کے لحاظ سے، نہ تو لفظ کا ظاہری ارادہ (پہلو) باطن کی نفی کرتا ہے اور نہ ہی باطنی ارادہ (پہلو) ظاہری پہلو کا مانع ہوتا ہے۔

۶۔ قرآن مجید نے کیوں دو طریقوں یعنی ظاہری اور باطنی طور پر بیان فرمایا ہے؟

۱۔ انسان نے اپنی ابتدائی زندگی میں جو کہ صرف دنیاوی اور عارضی زندگی ہے اپنی حیات کا خیمہ ایک سلسلے کی طرح مادّے (MATERIAL) سے اس کا ہمیشہ واسطہ ہے۔

اس کے اندرونی اور بیرونی حواس بھی مادّے اور مادیّات (MATERIALISM) میں مشغول ہیں اور اس کے افکار بھی محسوس معلومات کے پابند ہیں۔ کھانا، پینا، چلنا، آرام کرنا اور آخر کار اس کی زندگی کی ساری سرگرمیاں مادے کے اردگرد ہی گھومتی رہتی ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اور فکر ہی اس کے ذہن میں نہیں آتی۔

اور کبھی کبھی جب کہ بعض معنویات کو مثلاً دوستی، دشمنی، بلند ہمتی اور اعلیٰ عہدہ اور ایسے ہی دوسری چیزوں کا تصوّر کرتا ہے تو ان اکثر تصوّرات اور خیالات کو صرف مادی معیار پر پرکھتا اور انجام دیتا ہے مثلاً کامیابی کی مٹھائی کو کھانڈ، شکر اور مٹھائی کے ساتھ، جذبہ دوستی کو مقناطیس کی کشش کے ساتھ اور بلند ہمتی کو مکان اور مقام کی بلندی کے ساتھ یا ایک ستارے کی بلندی سے اور مقام و عہدے کو پہاڑ کی بلندی کے ساتھ تصوّر کرتا ہے۔

بہر حال افکار اور افہام معنویات کے مطالب کو حاصل کرنے کی توانائی میں جو مادّی دنیا سے بہت وسیع ہے، بہت ہی فرق رکھتے ہیں اور ان کے لئے کئی ایک مراحل ہیں۔ فکر و شعور معنویات کو تصوّر اور محسوس کرنے کی توانائی اور طاقت نہیں رکھتے۔ ایک اور دوسرا فکر تھوڑا سا اس سے اوپر ہے۔ اسی طرح یہاں تک کہ اس فکر و فہم تک رسائی ہو جائے جو وسیع ترین غیر مادی معنویات کو حاصل کرنے کی توانائی رکھتا ہو۔

بہر حال ایک فہم کی توانائی معنوی مطالب کو سمجھنے کے لئے جس قدر بھی زیادہ ہو گی اسی نسبت سے اس کی دلچسپی مادی دنیا اور اس کے دھوکے باز مظاہر کی طرف کمتر ہو گی اور اسی طرح جتنی بھی مادیات کی طرف دلچسپی کمتر ہو گی معنوی مطالب کو حاصل کرنے کی طاقت زیادہ ہو جائے گی۔ اسی طرح انسان اپنی انسانی فطرت کے ساتھ، سب کے سب ان مطالب کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور اگر اپنی قابلیت کو ضائع نہ کریں تو تربیّت کے قابل ہیں۔

۲۔ گزشتہ بیانات سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ فہم و شعور کے مختلف مراحل کی معلومات کو خود اس مرحلہ سے کمتر نہیں لایا جا سکتا ورنہ اس کا نتیجہ بالکل برعکس ہو گا خصوصاً ایسی معنویات جو مادے اور جسم کی سطح سے بہت بالاتر ہیں۔ اگر لیے پردہ

اور صاف صاف عوام کو بتائی جائیں جن کا فہم و شعور درحقیقت محسوسات سے آگے نہیں بڑھتا تو اس (کوشش) کا مطلب اور مقصد بالکل فوت ہو جائیگا (یعنی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا)

ہم یہاں پر مذہب اور ثنویت[1] کا ذکر کرسکتے ہیں۔ جو شخص گہرے غور و فکر کے ساتھ ہندی ویداؤں کے اپنشاد کے حصے پر سوچ بچار کرے اور اس حصے کے اطراف و جوانب (اردگرد) کے بیانات پر بھی غور کرے اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس کی تفسیر کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مطلب اور مقصد بھی توحید کے سوا اور یکتا پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن بدقسمتی سے چونکہ بے پردہ اور صاف صاف بیان ہوا ہے لہٰذا جب خدائے واحد کی توحید کا نقشہ جو اوپنشادوں میں پیش کیا گیا ہے اس پر عامیانہ سطح پر عملدرآمد ہوتا ہے تو بت پرستی اور مختلف خداؤں پر اعتراف و اعتقاد کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

پس بہرحال ما فوق العادت اور مادے کے اسرار کو دنیا والوں کے سامنے بے پردہ بیان نہیں کرنا چاہئے بلکہ ایسے بیانات پردے کے اندر کہنے چاہئیں۔

۳ ـ جبکہ دوسرے مذاہب میں بعض لوگ دین کے فوائد سے محروم ہیں مثلاً عورت، ہندو، یہودی اور عیسائی مذاہب میں عام طور پر مقدس کتابوں کے معارف اور تعلیمات سے محروم ہے لیکن اسلام کسی شخص یا صنف کے لئے بھی مذہبی فوائد سے محرومیت کا قائل نہیں ہے بلکہ خاص و عام، مرد و عورت، سیاہ و سفید، سب کے سب مذہبی امتیازات کو حاصل کرنے میں مساوی اور برابر ہیں، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے :۔

اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (آل عمران ۱۹۵)

ترجمہ: میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، تم سب مرد و زن ایک ہی قسم کے ہو۔ اور پھر فرماتا ہے :۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات ۱۳)

ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہیں چھوٹے بڑے گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم

---

[1] دو خداؤں پر اعتقاد یعنی خیر و شر، جسم و روح یا مادہ اور معنویت وغیرہ۔

کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ پس جو شخص تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہوگا خدا کے نزدیک سب سے عزیز ہوگا۔"

اس مقدمے کو بیان کرنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے اپنی تعلیمات میں صرف انسانیت کو مدنظر رکھا ہے، یعنی ہر انسان کو اس لحاظ سے کہ وہ انسان ہے قابلِ تربیت اور قابلِ ترقی سمجھا ہے، لہٰذا اپنی تعلیمات کو انسانی دنیا میں عام اور وسیع کر رکھا ہے۔

چونکہ معنویات کو سمجھنے کے لئے ذہنوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور جیسا کہ ظاہر ہے اور معلوم ہے معارفِ عالیہ کی تفسیر خطرے سے خالی نہیں ہے اسی لئے قرآن مجید نے اپنی تعلیمات کو سادہ ترین طریقے سے جو عام فہم ہے اور سادہ عام زبان میں عوام تک پہنچایا ہے اور بہت ہی سادہ زبان میں بات کہی ہے۔

البتہ اس طریقے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معارفِ عالیہ معنوی، سادہ اور عام زبان میں بیان ہوں اور الفاظ کے ظاہری معنی اور فرائض واضح طور پر محسوس ہوں اور معنویات ظواہر کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں اور پردے کے پیچھے عام فہم ہوں اور اسی طرح ہر شخص اپنے شعور و فہم اور عقل کے مطابق ان معانی اور معنویات سے مستفیض ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○ وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ ○ (زخرف ۳-۴)

ترجمہ: بیشک ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں، وہ زبان جو پڑھی جاتی ہے نازل کیا، تاکہ شاید تم اس میں غور و فکر کرو اور بیشک جب یہ قرآن ہمارے پاس ام الکتاب (لوحِ محفوظ) میں ہے اس قدر بلند مرتبے پر ہے جہاں عقلِ انسانی اور سمجھ ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ اس کی آیات بہت محکم اور پختہ ہیں جن میں انسانی فہم کو ہرگز دخل نہیں ہے۔

پھر ایک اور مثال جو حق و باطل اور ذہنوں کی گنجائش کے بارے میں لاتا ہے اس میں یوں فرماتا ہے:

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ (رعد ۱۷)

ترجمہ: خدا نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پس یہ پانی مختلف راستوں میں ان راستوں کی گنجائش کے مطابق جاری ہوگیا۔

اور پیغمبر اکرمؐ ایک مشہور حدیث شریف میں یوں فرماتے ہیں:

انّا معاشر الانبیاء نکلم الناس علیٰ قدر عقولھم

ترجمہ: ہم پیغمبر، لوگوں کے ساتھ ان کی عقل کے مطابق بات کرتے ہیں۔

اس طریقے اور بحث سے جو دوسرا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ایسے بیانات جن میں پوشیدہ اسرار مخفی ہوں مثال کا پہلو حاصل کر لیتے ہیں یعنی خدائی معارف کی نسبت جو عام انسانوں کے فہم و شعور سے بالاتر ہیں، ان کے بارے میں امثال موجود ہیں جو ان معارف کو اچھی طرح سمجھانے کے لئے لائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝ (اسراء - ۸۹)

ترجمہ: اور قسم کھاتا ہوں کہ ہم لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال لائے ہیں لیکن اکثر انسانوں نے ان کو قبول نہیں کیا اور کفرانِ نعمت کیا ہے۔

اور پھر فرماتا ہے: وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ (عنکبوت ۴۳)

ترجمہ: اور اگرچہ ہم لوگوں کے لئے بہت سی مثالیں لاتے ہیں لیکن وہ ان میں غور نہیں کرتے سوائے ان لوگوں کے جو سمجھ دار (عالم) ہیں۔

لہٰذا قرآن مجید بہت سی مثالوں کو بیان کرتا ہے لیکن مندرجہ بالا آیات اور جو کچھ اس مضمون میں آیا ہے کافی ہے۔ نتیجے کے طور پر ہمیں یوں کہنا چاہئے کہ معارف عالیہ کے بارے میں جو قرآن کے حقیقی مقاصد ہیں مثالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے

۷۔ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ موجود ہے

خداوند تعالیٰ اپنے کلام مجید میں فرماتا ہے:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود ۱) قرآن ایسی کتاب ہے جس کی آیات بہت محکم (پختہ، متقن) ہیں۔

اور پھر فرماتا ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (زمر ۲۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے بہترین بات (الفاظ۔ قرآن) نازل فرمائی ہے جس کی آیات آپس میں متشابہ اور شبیہ اور دو دو ہیں۔ اس کتاب کے باعث جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں (خوف سے) ان کی کھالیں اتر جاتی ہیں اور قرآن کو سن کر ان پر

لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ پھر فرماتا ہے:-

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (آل عمران ۷)

ترجمہ: خدا وہ ہے جس نے تجھ پر کتاب نازل فرمائی جبکہ اس کی بعض آیات محکم ہیں جو اس کتاب کی ام الکتاب، بنیاد، ماں اور مرجع ہیں اور بعض آیات متشابہ ہیں لیکن جن لوگوں کے دلوں میں کجروی ہے اور استقامت سے انحراف کی طرف مائل ہیں وہ اس کتاب کی متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو فریب اور دھوکہ دے سکیں اور اس طرح فتنہ برپا کریں اس لئے کہ اس کی تاویل بنانا چاہتے ہیں حالانکہ اس کی تاویل بھی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن جو لوگ اپنے علم میں ثابت قدم ہیں وہ متشابہ آیات کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں چونکہ یہ سب آیات خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔

جیسا کہ واضح ہے قرآن کی پہلی آیت اس کے پختہ (محکم) ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور البتہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب (قرآن) ہر قسم کے عیب و نقص اور خلل و بطلان سے مبرا ہے اور دوسری آیت تمام قرآن کو متشابہ کے طور پر متعارف کراتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ قرآنی آیات خوبصورتی، اسلوب، حلاوت، لہجے اور خارق العادت بیان کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ اور پورے قرآن کی یہی حالت ہے۔

اور تیسری آیت جو اس باب میں ہمارے پیش نظر ہے، قرآن مجید کو دو قسموں یعنی محکم اور متشابہ میں تقسیم کرتی ہے اور کلی طور پر قرآن مجید سے یوں نتیجہ نکلتا ہے:

اوّل یہ کہ محکم وہ آیت ہے جو اپنی دلیل و برہان اور ثبوت میں محکم اور پختہ ہو اور اس کے معنی اور مطالب میں کسی قسم کا شک و شبہ موجود نہ ہو یعنی حقیقی معنی کے علاوہ کوئی اور معنی اس سے اخذ نہ کئے جا سکیں اور متشابہ اس کے برخلاف ہے۔

اور تیسرا ہر مومن جو اپنے ایمان میں راسخ اور ثابت قدم ہے اس کا ایمانی فرض ہے کہ آیات محکمات پر ایمان

لائے اور عمل کرے اور اسی طرح متشابہ آیات پر بھی ایمان لائے لیکن ان پر عمل کرنے سے پرہیز کرے۔ صرف وہ لوگ جن کے دل منحرف اور ایمان ٹیڑھے ہیں وہ متشابہ آیات کی عوام کو فریب اور دھوکہ دینے کے لئے تاویلیں بنا بنا کر ان پر عمل کرتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔

۸۔ مفسّرین اور علماء کی نظر میں محکم اور متشابہ کے معانی

علمائے اسلام کے درمیان محکم اور متشابہ کے معانی میں بہت زیادہ اختلاف موجود ہے اور ان مختلف اقوال میں تحقیق سے اس مسئلے کے بارے میں تقریباً بیس اقوال مل سکتے ہیں۔

اوائل اسلام سے لے کر آج تک جو مسئلہ مفسرین کے لئے قابل قبول رہا ہے وہ یہ ہے کہ "محکمات" وہ آیات ہیں جن کے معانی واضح ہیں اور اصلی معانی کے علاوہ کوئی اور معانی ان سے نہیں لئے جا سکتے اور انسان ان کے بارے میں کسی شک و شبہ میں نہیں پڑتا۔ اس قسم کی آیات پر ایمان لانا فرض ہے اور عمل کرنا بھی فرض ہے اور "متشابہ" وہ آیات ہیں کہ جن کے ظاہری معنی مبہم ہیں اور ایسی آیات کے حقیقی معنی ان کی تاویل میں مضمر ہیں جو صرف خدا ہی جانتا ہے اور انسان کی عقل ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس قسم کی آیات پر ایمان تو لانا چاہئے لیکن ان کی پیروی اور ان پر عمل کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

علمائے اہلسنت کے درمیان بھی یہی قول مشہور ہے اور علمائے شیعہ بھی اسی پر متفق ہیں لیکن علمائے شیعہ معتقد ہیں کہ متشابہ آیات کی تاویل پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ بھی جانتے ہیں اور عام مسلمان اور مومن جو متشابہ آیات کی تاویل کو سمجھنے سے عاجز ہیں، ان کا علم خدا، پیغمبرؐ اور آئمہؑ پر چھوڑ دیں۔

یہ قول اگرچہ اکثر مفسّرین کے درمیان جاری اور قابلِ قبول ہے لیکن چند لحاظ سے اس آیہ کریمہ کے متن:

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ ..... الخ (آل عمران ۷)

اور ایسے ہی دوسری قرآنی آیات کے اسلوب پر منطبق نہیں ہے۔

سب سے پہلے تو یہ کہ قرآن مجید میں اس قسم کی آیتیں جو اپنے مدلول (معنی) کو تشخیص دینے میں عاجز ہوں، ان کا نام تک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ قرآن مجید اپنے آپ کو "نور"، "ہادی" اور "بیان" جیسی صفات کہہ کر پکارتا ہے

لہٰذا اس کی آیات حقیقی معنی اور مراد کو واضح کرنے میں نارسا یا مبہم نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آیۂ کریمہ: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ○ (النسا ۸۲)

ترجمہ: "آیا قرآن مجید میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے نازل ہوا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف موجود ہوتا" قرآن میں غور وفکر کرنا ہر قسم کے اختلاف کو رفع کرنے والا، مٹانے والا کہا گیا ہے، حالانکہ جیسا کہ مثل مشہور ہے آیہ متشابہ میں آنے والے اختلافات کسی طرح بھی قابل حل نہیں ہیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ آیات متشابہات سے مقصد اور مراد وہی حروف مقطعہ (حروف مخفف) ہیں جو کہ بعض سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں مثلاً الٓمٓ۔ الٓرٰ۔ حٰمٓ وغیرہ۔ جن کے حقیقی معنی کو تشخیص دینے میں کوئی طریقہ نہیں آ کے

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آیۂ کریمہ میں آیات متشابہ کو آیاتِ محکم کے مقابلہ میں متشابہ کہا گیا ہے، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت مدلولات لفظی (لفظی معانی) کی طرح معنی رکھتی ہو لیکن حقیقی اور اصل معنی، غیر حقیقی معنی کے ساتھ مشتبہ ہو جائیں اور بعض سورتوں کے شروع میں آنے والے مخفف الفاظ یا حروف اس قسم کے لفظی معنی نہیں رکھتے۔

اس کے علاوہ اس آیت کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ منحرف لوگ آیات متشابہات سے عوام کو گمراہ کرنے اور فریب دینے کے لئے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اسلام میں یہ سننے میں نہیں آیا کہ کوئی شخص سورتوں کے آغاز میں آنے والے مقطعہ یا مخفف حروف کی تاویل کرتے ہوئے اس قسم کا فائدہ اٹھائے اور جن لوگوں نے اس قسم کی تاویل کر کے فائدہ اٹھایا ہے انہوں نے نہ صرف انہی الفاظ سے بلکہ تمام قرآن کی تاویل کر کے اس قسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مذکورہ آیت میں متشابہ کی تاویل ایک مشہور قصّے کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے بموجب یہودیوں نے کوشش کی ہے کہ سورتوں کے آغاز میں آنے والے مقطعہ یا مخفف حروف سے اسلام کی بقاء اور دوام کی مدّت کو سمجھیں اور پیغمبر اکرمؐ نے یکے بعد دیگرے ایسے مخفف یا آغازی حروف پڑھ کر ان کے حساب کو غلط بنا دیا تھا[1]۔

یہ بات بھی بالکل بیہودہ ہے کیونکہ اس قصّے یا روایت کے صحیح ہونے کے بارے میں بعض یہودیوں نے بہت کچھ

---

[1] تفسیر عیاشی جلد اوّل صفحہ ۱۶ تفسیر قمی جلد اوّل سورۂ بقرہ اور تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۲۱۔

لکھا اور کہا ہے اور اسی محفل میں اس کا جواب بھی سن لیا ہے اور یہ قصہ اس قدر قابلِ اہمیت نہیں کہ آیہ کریمہ میں "متشابہ" کی تاویل کے مسئلے پر زور دیا جاتا۔

اس کے علاوہ یہودیوں کی بات میں کسی قسم کا فتنہ و فساد بھی نہیں تھا کیونکہ اگر ایک دینِ حقیقی ہو تو اگرچہ وہ وقتی اور قابلِ منسوخ بھی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی حقانیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا جیسا کہ اسلام سے پہلے آسمانی ادیان کی یہی حالت رہی ہے لیکن وہ سب کے سب حقیقی دین تھے۔

تیسرے، اس بات کی وجہ یہ ہے کہ آیۂ کریمہ میں لفظ تاویل کے معنی اور مدلول ظاہری معنی کے برعکس آئے ہوں اور اسی طرح آیاتِ متشابہ سے مخصوص ہوں، یہ دونوں مطالب ٹھیک نہیں ہیں اور آئندہ بحث میں جو تاویل اور تنزیل کے باب میں آئے گی ہم اس کے بارے میں وضاحت سے بیان کریں گے کہ قرآن مجید میں لفظ تاویل معنی اور مدلول کے پیرایہ میں نہیں آیا کہ کوئی دوسرا لفظ اس کا لغوی بدل بن سکے اور دوسرا یہ کہ تمام قرآنی آیات کیا وہ "محکم" ہوں یا "متشابہ"، ان کی تاویل ہو سکتی ہے اور نہ صرف آیات متشابہ کی۔ اور تیسرا یہ کہ آیہ کریمہ میں لفظ آیات محکمات کو فقرہ هُنَّ اُمُّ الْكِتَابِ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آیات محکمات کتاب کے اصلی مطالب پر مشتمل ہیں اور بقیہ آیات کے مطالب ان کی شاخیں (فروعات) ہیں۔ اس مطلب کا واضح مقصد یہ ہے کہ آیاتِ متشابہ اپنے معنی اور مراد کے لحاظ سے آیاتِ محکمات کی طرف لوٹ جائیں یعنی آیاتِ متشابہ کے معانی کی وضاحت کے لئے ان کو آیاتِ محکمات کی طرف رجوع دینا چاہئے اور آیاتِ محکمات کی مدد سے ان کے حقیقی معنی اور مراد کو سمجھنا چاہئے۔

لہٰذا قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت جس کے حقیقی معنی کو حاصل نہ کیا جا سکے موجود نہیں ہے اور قرآنی آیات یا بلاواسطہ محکمات میں شامل ہیں مثلاً خود آیاتِ محکمات اور یا باواسطہ محکم ہیں جیسا کہ متشابہات وغیرہ کی طرح، لیکن مقطعہ حروف (مخفف) جو سورتوں کے آغاز میں موجود ہیں ان کے لفظی معنی ہرگز معلوم نہیں ہیں۔ اس طرح یہ حروف، آیاتِ محکمات اور متشابہات دونوں قسموں میں سے نہیں لائے جا سکتے۔

اس مطلب کو سمجھنے کے لئے آیہ کریمہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ○

ترجمہ: تو کیا یہ لوگ قرآن میں (ذرا بھی) غور نہیں کرتے یا (ان کے) دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں۔ (سورہ محمد ۲۴)

اور اسی طرح آیہ کریمہ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○

ترجمہ: تو کیا یہ لوگ قرآن میں بھی غور نہیں کرتے اور (یہ خیال نہیں کرتے کہ) اگر خدا کے سوا اور کی طرف سے (آیا) ہوتا تو ضرور اس میں بڑا اختلاف پاتے۔ (سورہ نساء ۸۲) سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۹۔ قرآن کی محکم اور متشابہ آیات کے بارے میں آئمہ اہلبیتؑ کے نظریات

جیسا کہ آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے مختلف بیانات سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایسی متشابہ آیہ جس کے حقیقی معنی بالکل سمجھ سے باہر ہوں، ہرگز قرآن مجید میں موجود نہیں ہے بلکہ اگر ہر آیت اپنے حقیقی معانی میں مستقل نہ ہو تو دوسری آیات کے ذریعے اس کے حقیقی معانی کو سمجھا جا سکتا ہے اور یہ طریقہ متشابہ آیات کو آیاتِ محکمات کی طرف رجوع کرانا ہے جیسا کہ آیہ کریمہ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی (سورہ طٰہٰ ۵) ترجمہ: "خدا اپنے تخت پر بیٹھا ہے"۔ اور آیہ کریمہ وَّ جَآءَ رَبُّکَ (سورہ فجر ۲۲) ترجمہ: "اور تیرا خدا آ گیا"۔ ظاہری طور پر (خدا کی) جسمیت اور مادیت کا پتہ دیتی ہے لیکن ان دو آیاتِ کریمہ کو لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ (سورہ شوریٰ ۱۱) ترجمہ: "کوئی چیز خدا کی مانند نہیں ہے"۔ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے "بیٹھنے" اور "آنے" کی طرف جو اشارہ ہوا ہے وہ ظاہری معنی یعنی ایک جگہ پر بیٹھنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے سے بالکل متفاوت ہے۔

پیغمبر اکرمؐ قرآن مجید کے وصف اور تعریف میں فرماتے ہیں:

و ان القران لم ینزل لیکذب بعضه بعضاً ولکن نزل یصدق بعضه بعضاً فما عرفتم فاعملوا به وما تشابه علیکم فامنوا به[1]

ترجمہ: بیشک قرآن اس لئے نازل نہیں ہوا کہ بعض آیات کے ذریعے تصدیق کرے۔ پس جس چیز کو تم نے سمجھ لیا ہے اس پر عمل کرو اور جس چیز کے متعلق تمہیں شک و شبہ ہو اس پر صرف ایمان لاؤ۔

اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے الفاظ یہ ہیں:[2]

---

[1] در المنثور، جلد اوّل صفحہ ۸۔
[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۱۔

"لیشهد بعضه علیٰ بعض و ینطق بعضه ببعض"

ترجمہ: قرآن مجید کے بعض حصے بعض دوسرے حصوں کے بارے میں شہادت دیتے ہیں اور بعض حصوں کے باعث دوسرے حصے منطق ہو جاتے ہیں۔

آٹھویں امام علیہ السلام فرماتے ہیں[۱]:۔

"المحکم ما یعمل به والمتشابه ما اشتبه علیٰ جاهله۔"

ترجمہ: قرآن کی آیاتِ محکمات وہ ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے اور متشابہ آیات وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو نہ جانتا ہو تو ان کے معانی میں مشتبہ ہو۔

اور ایک روایت ہے کہ "محکم" اور "متشابہ" کے درمیان ایک نسبت موجود ہے اور ممکن ہے ایک آیت ایک موضوع کے بارے میں محکم ہو اور وہی آیت ایک دوسرے موضوع یا مطلب کے متعلق متشابہ ہو۔

اور آٹھویں امام علیہ السلام سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا[۲]:

من ردّ متشابه القرآن الیٰ محکمه هدی الیٰ صراط مستقیم، ثم قال انّ فی اخبارنا متشابها کمتشابه القرآن فردوا متشابهها الیٰ محکمها ولا تتبعوا متشابهها فتضلّوا۔

ترجمہ: جس شخص نے قرآن کی متشابہ آیات کو محکمات کی طرف رجوع کر دیا وہ راہِ راست پر ہدایت حاصل کر گیا۔ پھر فرمایا۔ بیشک ہماری احادیث میں بھی متشابہ ہے جیسا کہ قرآن مجید میں متشابہ موجود ہے۔ پس ان متشابہات کو محکمات کی طرف لے جاؤ اور صرف اکیلی متشابہ آیت کی پیروی نہ کرو کیونکہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ روایات اور خصوصاً آخری روایت اس موضوع میں واضح ہے کہ متشابہ ایک ایسی آیت ہے جو اپنے حقیقی معنی کو واضح کرنے میں مستقل نہ ہو اور دوسری محکمات آیات کے ذریعے واضح ہوتی ہے۔ یہ بات صحیح نہیں کہ متشابہ آیات کو سمجھا یا اس کے معانی تک پہنچا ہی نہیں جا سکتا۔

۱؎ تفسیر عیاشی، جلد اوّل صفحہ ۱۶۲۔

۱۰ — قرآن مجید تاویل اور تنزیل رکھتا ہے

"تأویلِ قرآن" کا لفظ قرآن مجید میں تین بار مختلف آیات میں آیا ہے:۔

۱۔ محکم اور متشابہ آیت جو پہلے نقل کی گئی ہے: فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ (سورہ آل عمران۔ آیت ۷)

ترجمہ: لیکن جن لوگوں کے دل میں کجروی ہے اور استقامت سے انحراف کی طرف مائل ہیں وہی متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو فریب اور دھوکہ دے سکیں اور اس طرح فتنہ برپا کریں، اس لئے کہ اس کی تاویل بنانا چاہتے ہیں، حالانکہ اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۲۔ آیہ کریمہ: وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ ؕ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُهٗ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ (سورہ اعراف: آیت ۵۲۔۵۳)

ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں، ان لوگوں کے لئے ہم نے ایسی کتاب نازل کی ہے کہ اس میں ہر چیز کی بنیاد کو علم و دانش کے مطابق مفصل بیان کیا ہے، یہ کتاب ان لوگوں کے لئے رحمت اور ہدایت ہے جو ایمان لائے ہیں۔ یہ لوگ پشیمان نہیں ہیں بلکہ کافر لوگ وہ لوگ جو خدا کی آیات اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اس دن کے منتظر ہیں، جب ان آیات کی تاویل اور ان کے حال و احوال (موت اور قیامت کے دن) سامنے آئیں گے اور انجام کار کو مشاہدہ کریں گے۔ جو لوگ اس دن کو بھولے ہوئے ہیں اس دن پشیمانی اور حسرت کے ساتھ افسوس کریں گے کہ خدا کے رسول اور پیغمبر اپنے روشن اور واضح دلائل کے ساتھ آئے اور ہمارے لئے ان کی وضاحت کی (کاش اس وقت ہم مخالفت نہ کرتے)

۳۔ آیہ کریمہ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی یہاں تک کہ فرماتا ہے بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ○ (سورہ یونس: آیت ۳۷۔۳۹)

ترجمہ: یہ قرآن افتراء نہیں ہے، یہاں تک کہ فرماتا ہے: بلکہ ان لوگوں نے اس کو جھٹلایا ہے جس چیز کا ان کو بالکل علم نہیں جبکہ ابھی تک اس کی تاویل ان کے لئے واضح نہیں ہوئی، اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے بھی خدا کی آیات کو جھٹلایا تھا۔ اے رسولؐ تم دیکھتے ہو کہ ان ظالموں کا انجام کیا ہوگا اور وہ کس طرح ہلاک ہوں گے۔

بہرحال "تاویل" کا لفظ "اوّل" سے نکلا ہے جس کے معنی رجوع کے ہیں اور تاویل سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف وہ آیت پھرتی ہے یا رجوع کرتی ہے اور تاویل کے مقابلے میں تنزیل کے معنی واضح ہیں یعنی تحت اللفظی معنی ہیں۔

۱۱ــــ مفسّرین اور علماء کی نظر میں تاویل کے معنی

مفسّرین اور علمائے کرام "تاویل" کے معنی میں شدید اختلاف نظر رکھتے ہیں اور اقوال و احادیث کی پیروی میں تاویل کے بارے میں دس سے زیادہ اقوال دیکھنے میں آتے ہیں لیکن ان سب اقوال میں سے دو زیادہ مشہور ہیں:۔

۱۔ علمائے قدیم تاویل کو تفسیر کے مترادف سمجھتے تھے لہٰذا تمام قرآنی آیات کی تاویل موجود ہے۔ لیکن آیہ کریمہ کے مطابق: وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيلَهُ اِلَّا اللّٰه۔ متشابہات کی تاویل کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اس لحاظ سے بعض علمائے قدیم نے کہا ہے کہ قرآن کی متشابہ آیات وہی حروف مقطّعہ (یا حروف مخفّف) ہیں جو بعض سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ایسی آیت جس کے معنی عوام پر واضح نہ ہوں حروفِ مقطّعہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے لیکن ہم نے گزشتہ ابواب میں اس عقیدے کے منسوخ ہونے پر کافی وضاحت کی ہے۔

بہرحال اس موضوع کے پیشِ نظر کہ قرآن مجید بعض آیات کی تاویل کو جاننے کے بارے میں خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب نہیں کرتا اور قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت جس کے معنی سب پر مجہول ہوں، موجود نہیں ہے اور حروفِ مقطّعہ بھی متشابہ آیات میں نہیں آتے واضح کرتا ہے کہ علماء جدید کے پیش نظر یہ قول باطل اور منسوخ و متروک ہے۔

۲ــ علماء جدید کے قول کے مطابق تاویل کے معنی ان ظاہری معنی کے برعکس ہیں جو ظاہری طور پر کلام سے حاصل ہوتے ہیں۔ بنابرایں تمام قرآنی آیات تاویل نہیں رکھتیں لہٰذا صرف متشابہ آیات ہی ہیں جو تاویل رکھتی ہیں اور ان کے معنی، ظاہری معنی کے برعکس ہیں جن کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ جیسا کہ آیات میں خدا کے بیٹھنے، مرضی، آنے، غضبناک ہونے، افسوس کرنے اور دوسری مادی تعریفات کو خدا سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور ایسے

ہی دوسری آیات جن میں پیغمبروں اور انبیائے معصوم کو گناہوں سے منسوب کیا گیا ہے۔

یہ مذہب اس قدر عملی واقع ہوا ہے کہ حالِ حاضر میں تاویل، ظاہری معنی کے برعکس ایک "حقیقتِ ثانیہ" بن گئی ہے اور قرآنی آیات کی تاویل کلامی جھگڑے یعنی علمِ کلام میں ظاہری لحاظ سے اور ظاہر کے برعکس اس کے معنی کرنا ایک ایسا طریقہ بن گیا ہے کہ خود یہ طریقہ تناقض سے خالی اور مبرا نہیں ہے[1]۔

یہ قول اگرچہ بہت مشہور ہے لیکن ٹھیک اور صحیح نہیں ہے اور قرآنی آیات کے ساتھ مطابق نہیں کیونکہ:

اوّل سورہ اعراف کی آیۂ کریمہ[53] هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ اور سورہ یونس کی آیہ کریمہ[39] بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ جو پچھلے ابواب میں آئی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سارا قرآن تاویل رکھتا ہے، نہ صرف آیات متشابہات جیسا کہ اس قول میں کہا گیا ہے۔ دوسرے اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن میں ایسی آیات موجود ہوں جن کے حقیقی معنی مشتبہ اور عوام پر مجہول ہوں اور خدا کے سوا ان سے کوئی شخص واقف نہ ہو اور ایسا کلام جو اپنے معانی کو واضح کرنے کے لئے گنگ اور مبہم ہو اس کو بلیغ کلام نہیں کہا جا سکتا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کلام اپنی فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے دنیا کو مقابلے کے لئے طلب کرے اور اپنی برتری کا اعلان کرے۔

اور تیسرے یہ کہ اس قول کے مطابق قرآنی حجت (دلیل و برہان) ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اس آیۂ کریمہ کے (نساء ۸۲) مطابق أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا کہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے، دوسرے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی آیات کے درمیان (اگرچہ یہ آیات بہت زیادہ فاصلۂ زمانی اور خاص اوضاع و احوال اور ماحول کے مطابق نازل ہوئی ہیں) معنی اور مدلول کے لحاظ سے ان میں کسی قسم کا اختلاف موجود نہیں جو ظاہری طور پر معلوم ہو بلکہ اگر ہو بھی تو آیات میں غور کرنے سے رفع ہو جاتا ہے۔

چوتھے یہ کہ اصولی طور پر محکم اور متشابہ آیات کی تاویل کے معنی ظاہری معنی کے برخلاف ہوں کوئی دلیل ہی نظر نہیں آتی۔ وہ تمام قرآنی آیات جن میں تاویل کا لفظ آیا ہے ان سے مقصد اس قسم کے معانی نہیں ہیں، مثلاً قصّۂ یوسف[4] میں تین جگہ تاویل کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب خواب کی تعبیر ہے اور ظاہر ہے کہ خواب کی تعبیر اس

---

[1] کیونکہ تاویل کے معنی کا بیان، اس اعتراف کے ساتھ کہ خدا کے سوا کوئی "تاویل" کے معنی کو نہیں جان سکتا، متناقص ہے لیکن اس بات کو احتمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

کے ظاہری معنی کے برخلاف نہیں ہے بلکہ ایک ایسی خارجی عینی حقیقت ہے جو خواب میں دیکھی گئی ہے جیسا کہ حضرت یوسفؑ اپنے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے سجدہ کرنے کو سورج، چاند اور ستاروں کی صورت میں دیکھا تھا۔[1] اور جیسا کہ مصر کے بادشاہ نے اس ملک میں سات سالہ قحط اور خشک سالی کو لاغر اور کمزور گائیوں کی شکل میں مشاہدہ کیا تھا کہ سات فربہ اور موٹی گائیوں کو کھا رہی ہیں اور اسی طرح سات سبز خوشے اور سات خشک خوشے دیکھے تھے اور جیسا کہ قید میں حضرت یوسفؑ کے ساتھیوں میں سے ایک نے سولی کو دوسرے نے بادشاہ کی ساقی گری کو انگوروں

---

[1] حضرت یوسفؑ کا خواب سورہ یوسفؑ کی آیت نمبر ۴ میں بیان ہوا ہے (جب حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا: "اے میرے باپ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، چاند اور سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں) اور اس آیہ کی تاویل آیت نمبر ۱۰۰ میں حضرت یوسفؑ کی زبانی بیان کی گئی ہے (چند سالوں کی جدائی کے بعد حضرت یوسفؑ کے ماں باپ اور بھائی ان سے ملنے کے لئے پہنچے اور حضرت یوسفؑ نے ان کو تخت پر بٹھایا اور ان کے ماں باپ اور بھائی حضرت یوسفؑ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ اے میرے ماں باپ یہ میرے خواب کی تاویل ہے۔

اور مصر کے بادشاہ کا خواب سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۴۳ میں بیان ہوا ہے (بادشاہ نے دیکھا کہ سات کمزور اور لاغر گائیں، سات موٹی اور فربہ گائیوں کو کھا رہی ہیں اور اسی طرح سات خشک خوشے، سات سبز اور رس بھرے خوشوں کو کھا رہے ہیں) اور اس کی تاویل آیت نمبر ۴۷ تا ۴۹ میں حضرت یوسفؑ کی زبانی بیان ہوئی ہے (حضرت یوسفؑ نے فرمایا) سات سال متواتر کھیتی باڑی کریں اور جو کچھ حاصل ہو اس کو محفوظ رکھیں اور کفایت شعاری سے کام لیں، تھوڑا کھائیں، اس کے بعد سات سال سخت قحط سالی اور خشک سالی آئے گی اور جو کچھ تم نے پہلے سات سالوں میں کمایا اور محفوظ کیا ہو گا ان سات سالوں میں ختم ہو جائے گا اور پھر اس کے بعد آٹھویں سال بارش آئیگی اور لوگ خوشحال ہو جائینگے۔

اور قید میں حضرت یوسفؑ کے ساتھ رہنے والے قیدیوں کے خواب سورہ یوسف کی آیت ۳۶ میں بیان ہوئے ہیں (حضرت یوسفؑ کے ساتھ دو جوان یا بادشاہ کے دو غلام قید تھے، ایک نے حضرت یوسفؑ سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ انگور کے خوشوں کو نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ اپنے سر پر روٹیوں کی ٹوکری اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے، چیلیں اور کوے ان کو کھا رہے ہیں۔ ان خوابوں کی تاویل حضرت یوسفؑ کی زبانی آیت نمبر ۴۱ میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر کرتے ہوئے فرمایا۔ اے میرے قیدی ساتھیو! تم میں سے پہلا بادشاہ کا ساقی بنے گا اور دوسرا پھانسی لگے گا اور پرندے اس کا سر کھائیں گے

کے گچھوں کو نچوڑنے اور اپنے سر پہ روٹیوں کا ٹوکرا اٹھانے اور پھر پرندوں کا ان روٹیوں کے نوچنے اور کھانے کی حالت میں دیکھا تھا۔

اسی طرح سورہ کہف (آیت ۷۱-۸۲) سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے قصے ہیں، اس کے بعد کہ حضرت خضرؑ کشتی کو سوراخ کر دیتے ہیں، پھر ایک بچے کو مار دیتے ہیں اور ایک دیوار کو تعمیر کرتے ہیں اور ہر مرحلے پر حضرت موسیٰؑ اعتراض کرتے ہیں۔ پھر حضرت خضرؑ ان سب کاموں کا جواب دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے امر اور حکم کے مطابق ان کاموں کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں، اس عمل کو "تاویل" کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت کار اور اس کا اصلی مقصد جو ظاہری عمل کی صورت میں آیا ہے، اس کے معنی کام کی روح اور حقیقت ہیں جن کو "تاویل" کہا گیا ہے اور ان کاموں کے معنی، ظاہری معنی کے برعکس نہیں ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ "وزن اور پیمانے" کے بارے میں فرماتا ہے :۔

وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ○ (بنی اسرائیل: آیت ۳۵)

ترجمہ: اور جب تم کسی چیز کو پیمانے اور وزن سے ناپتے ہو تو اس کو پوری طرح ناپو اور وزن کرو اور پیمانے کو اچھی طرح پُر کرو، اور صحیح ترازو سے وزن کرو کیونکہ یہی طریقہ بہتر ہے اور تاویل کے لحاظ سے ٹھیک بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیل (پیمانے) اور وزن سے مراد خاص اقتصادی حالت ہے جو ضروریات زندگی میں لین دین اور نقل و انتقال کے ذریعے بازار میں پیدا ہوتی ہے اور اس معنی میں "تاویل" وزن اور پیمانے کے خلاف نہیں بلکہ ایک معنوی اور ظاہری حقیقت ہے جو وزن اور پیمانے کی صورت میں بیان ہوئی ہے اور اس کی ٹھیک صورت عمل کے انجام دینے میں ظاہر ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے: ..... فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.... ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ○ (سورہ نساء آیت ۵۹)

ترجمہ: پس اگر ایک چیز کے بارے میں تم میں جھگڑا یا تنازعہ پیدا ہو جائے تو اس کو خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو ..... اور یہی بہتر ہے اور تاویل کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔

ظاہر ہے کہ تاویل سے مراد تنازعہ کو حل کرنے کے لئے خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنا ہے اور اس کا مقصد معاشرے

کی وحدت اور یگانگت کو مضبوط کرنا اور معاشرے میں معنوی اور روحی اتحاد پیدا کرنا ہے۔ یہ بھی ایک خارجی حقیقت ہے نہ کہ تنازعہ کو حل کرنے کے برعکس کوئی اور معنی ہوں۔

اسی طرح چند ایک دوسری مثالیں جن میں "تاویل" کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے اور مجموعی طور پر سولہ (۱۶) بار یہ ذکر ہوا ہے اور ان تمام مثالوں میں سے کسی میں بھی تاویل کے معنی کو ظاہری معنی کے برعکس نہیں لیا جا سکتا بلکہ ایک دوسرے معنی میں (کہ آئندہ فصل میں وضاحت سے بیان ہوگا) لفظ تاویل آیات محکمات اور متشابہات میں آیا ہے لہذا تاویل کا لفظ مندرجہ بالا آیات میں ظاہری معنی کے برخلاف کوئی دوسرے معنی نہیں دیتا۔

۱۲ — قرآن کی اصطلاح میں "تاویل" کے کیا معنی ہیں ؟

قرآن مجید میں ایسی آیات شریفہ جن میں تاویل کا لفظ آیا ہے اور ان میں بعض آیات کو پچھلے ابواب میں نقل کر چکے ہیں، ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ تاویل معنی کے لحاظ سے لفظی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جیسا کہ سورہ یوسف میں خوابوں کی تعبیر کے بارے میں نقل ہوا ہے اور ان خوابوں کی تاویل کی گئی ہے کہ ایسا لفظ جواب کی تشریح کرے ہرگز خواب کی تاویل میں لفظی ثبوت فراہم نہیں کرتا خواہ وہ ظاہری معنی کے برعکس ہی کیوں نہ ہو۔

اور ایسے ہی حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعے میں "قصے" کا لفظ اس کی تاویل پر دلالت نہیں کرتا جو حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ کے لئے بیان کئے تھے۔ اسی طرح آیہ شریفہ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ (۳۵/۱۷) دو فقرے کسی مخصوص اقتصادی حالت کا لفظی ثبوت فراہم نہیں کرتے لہذا ان کی تاویل ضروری ہے۔

اس طرح آیہ شریفہ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (۵۹/۴) اپنی تاویل پر لفظی ثبوت، جو وحدت اسلامی ہے، نہیں رکھتا اور اگر تمام آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ حقیقت یہی ہے۔

بلکہ خوابوں کے بارے میں، خواب کی تاویل ایک خارجی حقیقت ہے جو ایک خاص شکل میں خواب دیکھنے والے شخص کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے، اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے قصے میں وہ تاویل جو حضرت خضرؑ نے بیان کی، ایک ایسی حقیقت ہے کہ انجام شدہ کام اس حقیقت سے سرچشمہ حاصل کرتا ہے اور خود وہی کام ہی ایک طرح کی

تاویل میں مضمر ہے۔ وہ آیت جو وزن اور پیمانے کے صحیح ہونے پر حکم دیتی ہے اس کی تاویل ایک حقیقت اور مصلحت ہے کہ یہ فرمان اس حقیقت پر تکیہ کرتا ہے اور ایک طرح سے اس حقیقت کو ثابت اور مکمل کرتا ہے اور آیہ شریفہ جس میں جھگڑوں کو خدا اور رسول کی طرف لے جانے کا حکم ہے اس میں بھی یہی امر اور حقیقت پوشیدہ ہے۔

لہٰذا ہر چیز کی تاویل ایک ایسی حقیقت ہے کہ وہ چیز اس سے سرچشمہ حاصل کرتی ہو اور وہ چیز ہر طریقے سے اس کا مکمل ثبوت اور کامل نشانی ہے جیسا کہ تاویل کرنے والا ہر شخص خود زندہ اور موجود تاویل ہے اور تاویل کا ظہور بھی صاحبِ تاویل کے ساتھ ممکن ہے۔

یہ مطلب قرآن مجید میں بھی جاری ہے کیونکہ یہ مقدس کتاب ایک سلسلۂ حقائق اور معنویات سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے جو مادّے اور جسمانیّت کی قید سے آزاد اور حس و محسوس کے مرحلے سے بہت بالاتر ہیں اور الفاظ و عبارات کے قالب میں جو ہماری مادی زندگی کا محصول ہے، اس سے بہت وسیع اور بلند ہیں۔

یہ حقائق اور معنویات اپنی حقیقت کے اعتبار سے لفظی بیان کے قالب میں نہیں سما سکتے، صرف وہ امور جو غیب کی طرف سے انجام پاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ان الفاظ کے ساتھ دنیائے انسانی کو متنبّہ کیا گیا ہے کہ حق پر ظاہری اعتقادات اور اپنے نیک کاموں کے ذریعے اپنے آپ کو سعادت اور خوش بختی حاصل کرنے کے لئے مستعد کریں، کیونکہ سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے واقعیّت اور حقیقت کو سمجھیں، کوئی اور راستہ یا چارہ نہیں ہے۔ قیامت کا دن خدا سے ملاقات کا دن ہے جس دن یہ حقائق مکمل طور پر کھل کر سامنے آئیں گے جیسا کہ سورہ اعراف کی دو آیات اور سورہ یونس کی آیہ شریفہ اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (زخرف- آیہ ۲-۴)

ترجمہ: اس کتاب مبین کی قسم، ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم اس میں غور و فکر کرو اور یقیناً یہ کتاب ہمارے پاس ام الکتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے۔ اس کا مرتبہ بہت اونچا ہے کہ عام لوگ اس کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے اور اس کی آیات بہت ہی پختہ ہیں کہ انسانوں کی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں ہے۔

آیہ شریفہ کے آخری حصے کی تاویل اپنے معنی سے مطابقت کے لحاظ سے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، واضح ہے اور

خصوصاً اس لحاظ سے کہ خدا نے فرمایا ہے: لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اور یہ نہیں فرمایا کہ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَهٗ (شاید اس میں غور کرو) کیونکہ تاویل کی شناخت جیسا کہ محکم اور متشابہ آیات (وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ) میں فرمایا ہے، اہلِ انحراف کو متشابہ آیات کی پیروی کرنے پر سرزنش اور ملامت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی پیروی کرنے سے فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں اور ان کی تاویل بنانا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں فرمایا کہ وہ تاویل پیدا کرتے ہیں۔

پس قرآن مجید کی تاویل وہ حقیقت یا حقائق ہیں کہ امّ الکتاب (لوحِ محفوظ) میں خدا کے پاس موجود ہیں اور علمِ غیب سے اختصاص رکھتے ہیں۔

پھر ایک اور جگہ اسی مضمون کے قریب قریب فرماتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورہ واقعہ آیات ۷۵-۸۰)

ترجمہ: پس قسم ہے تاروں کی حالت کی اور یقیناً یہ ایسی قسم ہے کہ اگر تم (اس میں) غور کرو تو بہت بڑی قسم ہے کہ یہ قرآن مجید بہت ہی محترم ہے جس کے اسرار محفوظ اور پوشیدہ ہیں (لوحِ محفوظ یا ام الکتاب ہیں) یہ ایسی کتاب ہے کہ ان لوگوں کے سوا جو پاک اور مطہر ہیں اس کو چھو نہیں سکتے۔ یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے یہ آیاتِ کریمہ قرآن مجید کے لئے دو طرح کے مرتبوں یا رتبوں کو ثابت کرتی ہے۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اس کتاب کے پوشیدہ مقام کو کوئی شخص چھو یا مس نہیں کر سکتا اور ہر قسم کے مس سے محفوظ ہے اور مقامِ تنزیل یہ ہے کہ عام لوگوں کے لئے قابلِ فہم ہے (یعنی ایک پوشیدہ معنی ہیں کہ اس کو کوئی شخص نہیں جان سکتا اور دوسرے عام معنی ہیں کہ ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے)

جو نتیجہ مندرجہ بالا آیت یا گزشتہ آیات سے حاصل ہوتا ہے وہ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ کی استثناء ہے یعنی سوائے ان لوگوں کے جو قرآن کریم کی حقیقت اور تاویل سے باخبر ہیں (ان کے علاوہ کوئی شخص اس کو چھو نہیں سکتا) اور یہ ثبوت آیۂ شریفہ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ کے مضمون نفی کے منافی نہیں ہے کیونکہ دو آیات کے باہمی انضمام سے تابعیت اور استقلال کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ ان حقائق کے ساتھ اپنے علم میں مستقل ہے اور اس کے سوا ان حقائق کو کوئی نہیں سمجھ سکتا مگر خدا کی اجازت اور تعلیم کے ساتھ۔

جیسا کہ علمِ غیب ہے جو بہت زیادہ آیات کے مطابق صرف خدا سے مخصوص ہے لیکن ایک آیت میں بعض لوگ جو

اس کے برگزیدہ اور پسندیدہ ہیں اس قاعدے سے مستثنےٰ ہیں :

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ○ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (سورہ جن آیت ۲۷)

ترجمہ: اور صرف اللہ تعالیٰ ہی علم عیب کو جانتا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا علم غیب سے واقف نہیں ہے مگر وہ برگزیدہ رسول جن پر وہ راضی ہے۔

اس کلام سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم غیب صرف خدا سے مخصوص ہے اس کے بغیر دوسرا کوئی نہیں جان سکتا مگر اس کے اذن اور اجازت سے۔

ہاں، قرآن کی ان آیات کے مطابق خدا کے پاک بندے قرآن کی حقیقت اور اسرار کو سمجھ سکتے ہیں اور آیہ کریمہ:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ○ (احزاب ۳۳)

ترجمہ: "خدا چاہتا ہے کہ ہر قسم کی ناپاکی اور پلیدی کو پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیتؑ اور خاندانِ رسالت سے دور کر کے تم کو ہر عیب سے پاک اور منزہ کر دے۔" کی رُو سے جو متواتر اخبار یا احادیث کے مطابق اہلِ بیتؑ پیغمبرؐ کے حق میں نازل ہوئی ہے پیغمبر اکرمؐ اور خاندان رسالتؑ خدا کے پاک بندوں میں سے ہیں اور قرآنی تاویل کا علم رکھتے ہیں۔

۱۳ — قرآن مجید ناسخ اور منسوخ کا علم رکھتا ہے

قرآن مجید میں احکام پر مبنی آیات کے درمیان بعض ایسی آیات موجود ہیں کہ جو نازل ہونے کے بعد پہلے نازل شدہ احکامی آیات کی جگہ لے لیتی ہیں جن پر اس سے پہلے عمل ہوتا تھا لہٰذا ان آیات کے نازل ہونے کے ساتھ ہی پہلے سے موجود احکام ختم ہو جاتے ہیں، اس طرح پہلی آیات منسوخ ہو جاتی ہیں اور بعد میں آنے والی آیات جو پہلی آیات پر حاکم بن کر آئی ہیں ان کو "ناسخ" کہا جاتا ہے جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ کی بعثت کے آغاز میں مسلمانوں کو حکم ملا تھا کہ دوسری اہلِ کتاب قوموں کے ساتھ باہمی مفاہمت اور میل جول سے زندگی بسر کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ (سورہ بقرہ آیت ۱۰۹)

ترجمہ: پس عفو و درگزر کرو، بخش دو (ان کی خطاؤں کو نظر انداز کر دو)، یہاں تک کہ خدا کی طرف سے حکم آئے۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی آیہ قتال (جنگ، جہاد) نازل ہوئی اور مفاہمت و مسالمت کا حکم منسوخ ہو گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ (سورہ توبہ آیت ۲۹)

ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرو جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور جس چیز کو خدا اور پیغمبرؐ نے حرام کیا ہے اس چیز کو حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو انتخاب نہیں کرتے، یہ وہی "اہلِ کتاب" ہیں۔

البتہ منسوخ کرنے کی حقیقت جو ہمارے درمیان رائج ہے وہ یہ ہے کہ (افراد) مصلحت کے پیشِ نظر ایک حکم یا قانون بنا کر تعمیل کے لئے نافذ کرتے ہیں اور تھوڑے عرصہ کے بعد اپنی غلطی اور خطا کا احساس کرتے ہوئے پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے قانون کو اس کی جگہ جاگزین کر دیتے ہیں لیکن ایسا نسخ (منسوخ کرنا) جو جہل و خطا کے ہمراہ ہو خدا سے منسوب نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اللہ بارک و تعالیٰ ہر خطا سے پاک ہے اور قرآن مجید میں کوئی ایسا حکم موجود نہیں ہے کہ جن کی آیات میں کسی قسم کا اختلاف ہو۔

بلکہ قرآن مجید میں نسخ کا بیان، منسوخ شدہ حکم کے ابطال کا زمانہ لیا جاتا ہے اس طرح کہ پہلے حکم کے بنانے اور نافذ کرنے کی مصلحت محدود اور وقتی ہے لہٰذا فطری طور پر اس حکم کا اثر بھی محدود ہو گا۔ کچھ عرصہ بعد دوسرا حکم آگیا تاکہ پہلے حکم کے اختتام کا اعلان کرے۔ اس مسئلے کے پیشِ نظر کہ قرآن مجید تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں بتدریج نازل ہوا ہے لہٰذا ایسے احکام کا ہونا مکمل طور پر قابلِ تصوّر ہے۔

البتہ وقتی طور پر ایک حکم یا قانون بنانا جو بھی مکمل اور مستقل نہ ہو اور اس کی مدت ختم ہونے کے بعد اسی حکم یا قانون کو مستقل یا قائم کر دینے میں کوئی عیب و ہرج نہیں ہے۔ قرآن مجید سے بھی نسخ کے یہی معنی حاصل ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ ۙ وَّاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ○ (سورہ نحل آیت ۱۰۱-۱۰۲)

ترجمہ: اور جب ہم نے ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کر کے پہلی کو بدل دیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ جو کچھ نازل فرماتا ہے اس کے بارے میں مکمل علم رکھتا ہے۔ کافر لوگ تہمتیں باندھتے ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے۔ اے پیغمبرؐ! تو کہہ دے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو اپنے عقائد میں مضبوط کر دے اور جو لوگ خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں

ان کے لئے بشارت، خوشخبری اور ہدایت ہو۔

۱۴ ـــــــ قرآن مجید میں "جری اور انطباق"

اس امر کے پیش نظر کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو عمومی اور ہمیشگی ہے اور اس کے پنہاں مضامین بھی ظاہری مفاہیم کی طرح جاری ہیں اور مستقبل اور ماضی کے ساتھ بھی زمانۂ حال کی طرح منطبق ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کتاب کی آیات جو نازل ہوتے کے زمانہ میں مسلمانوں کے لئے فرائض تعیّن کرتی ہیں، نازل ہونے کے بعد ان مومنوں کے لئے جو پہلے مومنوں جیسی شرائط رکھتے ہوں، کسی کمی بیشی کے بغیر فرائض کو معین کرتی ہیں۔ ایسی آیات جو مختلف الصفات اشخاص کی تعریف یا ان کو سرزنش کرتی ہیں یا ان کو خوشخبری سناتی ہیں یا خدا سے ڈراتی ہیں۔ جو لوگ مستقبل یا ہر زمانے میں وہی صفات رکھتے ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں، ان آیات کے زمرے میں آتے ہیں۔

لہٰذا ایک آیت کا نزول اسی آیت سے مخصوص نہیں ہوگا یعنی جو آیت ایک خاص شخص یا فرد کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ اپنے نزول کے بارے میں منجمد نہیں ہے بلکہ انہی خصوصیات اور صفات کے زمرے میں جو اشخاص یا افراد آئیں گے وہ آیت ان سے بھی تطبیق کرے گی اور یہ خصوصیات وہی ہیں جن کو روایات کے لحاظ سے جری (یعنی جاری ہونا) کہا جاتا ہے۔

پانچویں امام (حضرت محمد باقرؑ) ایک روایت میں فرماتے ہیں: "اگر ایسا ہو کہ ایک آیت جب ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور قوم مر گئی ہے تو اس آیت کا مفہوم بھی ختم ہو جائے گا تو قرآن میں کوئی چیز باقی نہیں رہے گی لیکن قرآن تعجب تک آسمان اور زمین باقی ہیں جاری ہے اور رہے گا، لہٰذا ہر قوم کے لئے ایک آیت ہے جو اس کو پڑھتی ہے تو اس سے اچھا اور برا فائدہ اٹھاتی ہے[۱]

بعض دوسری[۲] روایات میں قرآن مجید کے باطن یعنی قرآن مجید کے انطباق کو بھی جو وضاحت (تفسیر) کے ذریعے پیدا ہوتا ہے "جری" کے زمرے میں لاتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر عیاشی، قم، حصہ اوّل، صفحہ ۱۰۔

[۲] مصدر سابق، حصہ اوّل صفحہ ۱۱۔ روایت فضیل، پانچویں امامؑ سے روایت۔

۱۵ ـــــ قرآن مجید کے الفاظ کی تفسیر، اس کی ابتدا اور ترقی

قرآن مجید کے الفاظ و عبارات اور بیانات کی تفسیر اس کے نازل ہونے کے زمانے سے ہی شروع ہو گئی تھی اور خود پیغمبر اکرمؐ قرآن کی تعلیم، معانی کے بیان اور آیات کریمہ کے مقاصد کی وضاحت کیا کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورہ نحل، آیت ۴۴)

ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے تاکہ جو کچھ ہم نے نازل کیا ہے اس کو لوگوں کے لئے بیان کرو۔

اور پھر فرمایا: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ جمعہ آیت ۲)

ترجمہ: خدا وہ ہے جس نے اُمّی (ان پڑھ لوگوں) میں سے ایک پیغمبر بھیجا کہ اس کی آیات کو لوگوں کے لئے پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور ان کو تعلیم دیتا ہے۔

آنحضرتؐ کے زمانے میں آپؐ کے حکم سے بعض لوگ قرآن مجید کی قرأت، حفظ اور اس کو محفوظ رکھنے میں مصروف تھے جن کو "قراء" (قاری) کہا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کے صحابہ نے اور ان کے بعد سب مسلمان قرآن مجید کی تفسیر میں مشغول اور مصروف رہے اور آج تک مصروف ہیں۔

۱۶ ـــــ تفسیر کا علم اور مفسّرین کے طبقات

پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد بعض صحابہ کرام مثلاً ابی بن کعب، عبداللہ ابن مسعود، جابر بن عبداللہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن زبیر، انس، ابوہریرہ، ابوموسیٰ اور سب سے مشہور ترین عبداللہ بن عباس قرآن کی تفسیر میں مشغول تھے۔ تفسیر میں ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ کبھی کبھی قرآنی آیات کے معانی سے متعلق جو کچھ انہوں نے حضرت پیغمبر اکرمؐ سے سنا تھا اس کو روایت اور حدیث کے پیرائے میں نقل کرتے تھے[1]۔ یہ حدیثیں قرآن کے اوّل سے لے کر آخر تک تقریباً ۲۴۰

---

[1] آخر "اتقان" سیوطی، قاہرہ، ۱۳۷۰ھ

سے زیادہ ہیں جن میں بہت سی غیر مستند اور ضعیف حدیثیں بھی شامل ہیں اور بعض کا متن قابلِ انکار ہے اور کبھی کبھی آیات کی تفسیر سے متعلق (انفرادی طور پر) اظہار خیال کیا گیا ہے بغیر اس کے کہ آنحضرتؐ سے اس کو منسوب کریں، اس طرح اپنے خیالات اور مطالب کو مسلمانوں پر ٹھونسا گیا ہے۔

اہلسنّت کے متاخر مفسرّین اور علماء اس قسم کی روایات اور احادیث کو تفسیر میں احادیثِ نبوی میں شمار کرتے تھے کیونکہ (ان کے خیال کے مطابق) صحابہ نے قرآن مجید کا علم خود حضرت رسالتمآبؐ سے سیکھا تھا اور بعید ہے کہ خود انہوں نے اس میں کمی بیشی کی ہو۔

لیکن اس کے متعلق کوئی قطعی دلیل نہیں ہے اس کے علاوہ بہت زیادہ ایسی روایات بھی ہیں کہ جو آیات کے اسباب نزول اور تاریخی قصّوں میں داخل ہو گئی ہیں اور اسی طرح انہی روایاتِ صحابہ میں بہت سے یہودی علماء جو مسلمان ہو گئے تھے مثلاً کعب الاحبار وغیرہ کی بہت سی احادیث شامل ہو گئی ہیں لیکن کسی سند کے بغیر۔

اسی طرح ابن عباس بیشتر اوقات آیات کے معنی واضح کرنے کے لئے شعروں سے مثالیں لاتے تھے جیسا کہ نافع بن ازرق کے سوالات کے جوابات میں ابن عباس سے ایک روایت میں آیا ہے کہ دو سو اور کچھ سوالات کے جواب میں عربی اشعار سے مثال دیتے ہیں۔ اور سیوطی اپنی کتاب "اتقان"[1] میں ایک سو نوے (۱۹۰) سوالات لایا ہے۔ اسی طرح ایسی روایات اور احادیث جو مفسرّین صحابہ سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو احادیث نبوی میں نہیں شامل کیا جا سکتا اور ان میں صحابہ کی نظری مداخلت کی نفی بھی نہیں کی جا سکتی لہٰذا مفسرّین صحابہ طبقہ اوّل میں آتے ہیں۔

طبقۂ دوم: دوسرا طبقہ تابعین کا گروہ ہے جو مفسرّین صحابہ کے شاگردوں میں سے ہیں مثلاً مجاہد[2]، سعید بن جبیر، عکرمہ، ضحاک اور اسی طبقے کے دوسرے مفسرّین مثلاً حسن بصری، عطا بن ابی رباح، عطا بن ابی مسلم، ابو العالیہ، محمد بن کعب قرظی، قتادہ، عطیہ، زید بن اسلم اور طاؤس یمانی وغیرہ۔

---

[1] اتقان، صفحہ ۱۲۰ - ۱۳۳۔

[2] مجاہد: مشہور مفسر متوفی ۱۰۰ - ۱۰۳ ہجری قمری (تہذیب الاسماء نووی)

سعید بن جبیر: مشہور مفسر اور ابن عباس کے شاگرد جو حجاج بن یوسف کے ہاتھوں ۹۴ ہجری قمری میں شہید ہوئے (تہذیب)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

طبقۂ سوم:۔ تیسرا طبقہ دوسرے طبقہ کے شاگردوں پر مبنی ہے مثلاً ربیع بن انس، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ابو صالح کلبی وغیرہ۔ تفسیر میں تابعین کا طریقہ کار یہ تھا کہ آیات کی تفسیر کو کبھی پیغمبر اکرمؐ سے براہِ راست کے طور پر یا صحابہ سے نقل کرتے تھے اور کبھی آیات کے معانی کو بغیر کسی سے منسوب کئے لکھ دیتے تھے۔ وہ اپنی اظہار رائے پر اعتراض کرتے تھے۔ بعد کے مفسّرین نے ان اقوال کو احادیثِ نبوی میں درج کر لیا۔ ایسی روایات و احادیث کو "موقوفہ"[1] کہتے ہیں۔ قدیم مفسّرین انہی دو طبقوں پر مشتمل ہیں۔

طبقۂ چہارم:۔ یہ طبقہ پہلے طبقہ کے مفسرین کی طرح ہے جیسے سفیان بن عینیہ[2]، وکیع بن جراح، شعبہ بن حجاج، عبد بن حمید وغیرہ اور مشہور مفسّر ابن جریر طبری بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

بقیہ ص۴۹:۔

عکرمہ: ابن عباس کا شاگرد اور غلام جو سعید بن جبیر کا شاگرد تھا۔ متوفی ۱۰۴ھ (تہذیب)

ضحاک: عکرمہ کے شاگردوں میں سے تھا۔ (لسان المیزان)

حسن بصری: مشہور زاہد اور مفسّر، ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب)

عطا بن ابی رباح: فقیہ اور مشہور مفسّر جو ابن عباس کے شاگردوں میں تھا۔ متوفی ۱۱۵ھ (تہذیب)

عطا بن ابی مسلم: تابعین میں سے تھے اور ابن جبیر کے شاگرد تھے۔ متوفی ۱۳۳ھ 〃

ابو العالیہ: آئمہ مفسرین میں سے تھے جو تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ پہلی صدی ہجری میں زندہ تھے۔

محمد بن کعب قرظی: مشہور مفسر اور یہودی نسل میں سے تھے ان کا تعلق قبیلہ بنو قریظہ سے تھا۔ پہلی صدی ہجری میں زندہ تھے۔

قتادہ: فن تفسیر کے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں، حسن بصری اور عکرمہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ وفات ۱۱۷ھ (تہذیب)

عطیہ: صاحب کتاب "لسان"۔ ان کا ذکر ابن عباس نے کیا ہے۔ (لسان)

زید بن اسلم: عمرؓ بن خطاب کے غلام، مشہور فقیہ اور مفسّر تھے۔ وفات ۱۳۶ھ۔

طاؤس یمانی: اپنے وقت کے مشہور عالم اور ابن عباس کے شاگرد تھے۔ وفات ۱۰۶ھ (تہذیب)

[1] روایت موقوفہ ایسی روایت کو کہتے ہیں جس کا راوی معلوم نہ ہو یا اس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

[2] ابو سفیان بن عینیہ مکی: تابعین کے طبقہ دوم سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے علماء اور مفسرین میں سے تھے۔ وفات ۱۹۸ھ (تہذیب)

(بقیہ اگلے صفحے پر)

اس گروہ کا طریقہ کار بھی ایسا تھا کہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کو روایات کی صورت میں اپنی تالیفات میں داخل کر لیتے تھے لیکن انفرادی نظر اور رائے سے پرہیز کرتے تھے۔ ان میں سے سوائے ابن جریر طبری کے اپنی تفسیر میں کبھی کبھی اقوال میں سے بعض کو ترجیح دیتے تھے اور اس پر اظہار خیال کرتے تھے۔ متاخرین طبقہ انہی میں سے شروع ہوتا ہے۔

طبقہ پنجم :۔ اس گروہ میں ایسے حضرات شامل ہیں جو احادیث و روایات کو سند کے بغیر ہی اپنی تالیفات میں درج کر لیتے تھے اور صرف نقلِ اقوال پر ہی قناعت کرتے تھے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ تفسیر کی ترتیب اور انضباط میں گڑبڑ یہیں سے شروع ہوئی ہے اور ان تفاسیر میں بہت زیادہ اقوال کسی سند اور صحت و اعتبار کے بغیر داخل ہو گئے ہیں اور سند کی صحیح تشخیص صحابہ اور تابعین سے منسوب کی گئی ہے اس ہرج و مرج کے سبب بہت زیادہ اقوال تفسیروں میں داخل ہو گئے ہیں جن سے اقوال کی صحت و سند متزلزل ہو کر رہ گئی ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص "روایات معنعن[1]" (انتسابی) پر غور و فکر کرے تو کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا کہ ان روایات و احادیث میں بناوٹی (جعلی حدیثیں) بہت زیادہ ہیں۔ متدافع اور متناقض اقوال ایک صحابی یا تابعی سے منسوب کئے گئے ہیں اور ایسے قصے اور حکایتیں جو بالکل جھوٹی ہیں، ان راویتوں میں بہت زیادہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ آیات کے اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ کے بارے میں وہ روایتیں جو قرآنی آیات کے سیاق و سباق کے مطابق نہیں ہیں۔ ایک دو نہیں جن سے چشم پوشی کی جا سکے۔ یہاں تک کہ امام احمد حنبل (جو خود اس طبقہ کے وجود میں آنے سے پہلے تھے) نے فرمایا ہے: تین چیزوں کی کوئی بنیاد نہیں (۱) لڑائی (۲) خونریز جنگ اور (۳) تفسیری روایتیں

بقیہ صد ۵۰

وکیع بن جراح: تابعین کے طبقہ دوم میں سے تھے، مفسر قرآن تھے۔ وفات ۱۹۷ھ (تہذیب)

شعبۃ بن الحجاج بصری: تابعین کے طبقہ دوم میں شمار ہوتے تھے، مفسر قرآن تھے۔ وفات ۱۶۰ھ (تہذیب)

عبد بن حمید: صاحب تفسیر اور تابعین کے دوسرے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری صدی ہجری میں زندہ تھے۔

ابن جریر طبری: محمد بن جریر بن یزید طبری اہلسنت کے مشہور ترین علماء میں سے تھے۔ وفات ۳۱۰ھ (لسان المیزان)

[1] ایسی روایت یا حدیث جو کئی وسیلوں سے پیغمبر اکرمؐ سے منسوب ہوتی ہو یعنی راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے سنی ہے، اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے، .... وغیرہ۔

اور ایسے ہی امام شافعی کا بیان ہے کہ ابن عباس سے مروی حدیثوں میں سے صرف تقریباً ایک سو حدیثیں ثابت شدہ ہیں۔

طبقہ ششم: اس جماعت میں ایسے مفسرین شامل ہیں جو اسلام میں مختلف علوم کی پیدائش اور ترقی کے بعد پیدا ہوئے ہیں اور ہر علم کے ماہرین نے اپنے مخصوص اندازِ فن کے ذریعے قرآن کی تفسیر شروع کی: علم نحو کے ماہرین نے نحو کے ذریعے جیسے زجاج، واحدی اور ابی حیان[1] جنہوں نے قرآنی آیات پر اعراب لگانے کے موضوع پر بحث کی ہے، فصاحت و بلاغت کے موضوع پر علامہ زمخشری[2] نے اپنی کتاب "کشاف" میں اظہارِ خیال کیا ہے علم کلام کے ماہرین نے علم کلام کے ذریعے اپنی کتابوں میں وضاحت کی ہے مثلاً امام فخرالدین رازی[3] نے تفسیر کبیر میں، عارفوں نے عرفان کے ذریعے مثلاً ابن عربی اور عبدالرزاق کاشی[4] نے اپنی اپنی تفسیروں میں، علم اخبار (حدیث) کے عالموں نے اخبار (احادیث و روایات) نقل کر کے مثلاً ثعلبی[5] نے اپنی تفسیر میں، فقیہوں نے فقہ کے وسیلے سے جیسے قرطبی[6] اور بعض دوسرے حضرات نے بھی مخلوط تفسیریں علوم متفرقہ کے باب میں لکھی ہیں مثلاً تفسیر روح البیان[7]، تفسیر روح المعانی[8] اور تفسیر نیشاپوری[9] وغیرہ۔

---

[1] زجاج: علم نحو کے عالم۔ متوفی ۳۱۰ھ (ریحانہ)

واحدی: مفسر اور علم نحو کے عالم، متوفی ۴۶۸ھ "

ابوحیان اندلسی: عالم نحو، مفسر اور قاری۔ ۷۴۵ھ میں مصر میں وفات پائی۔ "

[2] زمخشری: علمائے ادب میں مشہور ہیں۔ انکی کتاب "تفسیر کشاف" بہت معروف ہے۔ وفات ۵۳۸ھ (کشف الظنون)

[3] امام فخرالدین رازی: متکلم اور مشہور مفسر، صاحب "تفسیر مفاتیح الغیب"۔ وفات ۶۰۶ھ۔ "

[4] عبدالرزاق کاشی: چھٹی صدی ہجری کے مشہور عارف علما میں سے ہیں۔ وفات ۷۵۱-۷۲۰ھ (ریحانہ)

[5] احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی: صاحب تفسیر ثعلبی۔ وفات ۴۲۶-۴۲۷ "

[6] محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی: متوفی ۶۶۸ھ "

[7] تفسیر روح البیان: تالیف شیخ اسمٰعیل حقی اسلامبولی۔ وفات ۱۱۳۷ھ (ملحقات کشف الظنون)

[8] تفسیر روح المعانی: تالیف شہاب الدین محمود آلوسی بغدادی۔ وفات ۱۲۷۰ھ "

[9] غرائب القرآن کے نام سے ایک تفسیر ہے جو نظام الدین حسنی قمی نیشاپوری کی تالیف ہے۔ وفات ۷۲۸ھ "

عالمِ تفسیر کے لئے اس گروہ کی خدمت یہ ہوئی کہ فنِ تفسیر اس انجماد اور رکود کی حالت سے باہر آگیا جو پہلے پانچ طبقوں میں موجود تھا اور اس طرح ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگیا جو بحث و تمحیص کا مرحلہ تھا۔ اگر کوئی شخص نگاہِ انصاف سے دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس طبقے کی تفسیری بحثوں میں علمی نظریات قرآن پر ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن خود قرآنی آیات پر ان کے مضامین کے لحاظ سے بحث نہیں ہوئی ہے۔

۱۷۔ شیعہ مفسّرین اور ان کے مختلف طبقات کا طریقۂ کار

جن گروہوں کے متعلق پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اہلسنت کے طبقات کے مفسرین سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا طریقۂ کار ایک خاص روش پر مبنی ہے جو شروع ہی سے تفسیر میں جاری ہو گئی تھی اور وہ ہے احادیثِ نبویؐ کا صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال کے ساتھ معاملہ جن میں مداخلتِ نظریہ ایسے ہی ہے جیسے نصِّ قرآن کے مقابلے میں اجتہاد ہو، یہاں تک کہ ان روایات میں جعل سازی، تضّاد اور تناقض آشکار ہونے لگا اور ایسے ہی بناوٹ اور جعل کے ذریعے ان مفسرین کو مداخلتِ نظریہ کا بہانہ ہاتھ آگیا۔

لیکن وہ طریقۂ کار جو شیعوں نے قرآنی تفسیر میں اپنایا ہے وہ مندرجہ بالا روش کے برعکس ہے، لہٰذا اختلاف کے نتیجے میں مفسرین کی طبقہ بندی بھی دوسری طرح کی ہے۔

شیعہ حضرات قرآن مجید کی نصِ شریفہ کے مطابق حضرت پیغمبر اکرمؐ کی حدیث کو قرآنی آیات کی تفسیر میں حجّت سمجھتے ہیں اور صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال کے بارے میں دوسرے تمام مسلمانوں کی طرح بالکل کسی حجّت کے قائل نہیں ہیں، البتّہ سوائے پیغمبر اکرمؐ سے منسوب احادیث کے بغیر۔ اس کے علاوہ شیعہ حضرات حدیث متواتر ثقلین کی ترتیب سے اہلبیتؑ اور آئمہ اطہارؑ کے اقوال کو پیغمبر اکرمؐ کی احادیث کی کڑیاں جان کر ان کو حجّت سمجھتے ہیں۔ اس طرح تفسیری احادیث و روایات کو نقل اور بیان کرنے کے لئے صرف ایسی روایات پر اکتفاء کرتے ہیں جو فقط پیغمبرؐ اکرم اور آئمہ اہلبیتؑ سے نقل ہوئی ہوں، لہٰذا ان کے مندرجہ ذیل طبقات ہیں:۔

طبقۂ اوّل:۔ اس گروہ میں وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے روایاتِ تفسیر کو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ سے سیکھا ہے اور اپنے اصول میں بے ترتیبی سے ثبت کر کے ان کی روائت شروع کر دی ہے، جیسے

زرارہ، محمد بن مسلم، معروف اور حریز[1] وغیرہ۔

طبقہ دوم: یہ حضرات تفسیر کی کتابوں کے مؤلف اور مفسّر ہیں مثلاً فرات بن ابراہیم[2]، ابو حمزہ ثمالی، عیاشی، علی بن ابراہیم قمی اور نعمانی، صاحبِ تفسیر ہیں۔ ان حضرات کا شیوہ کار اہل سنّت کے طبقہ چہارم کے مفسّرین کی طرح یہ تھا کہ لکھی ہوئی روایات کو جو طبقۂ اوّل سے ہاتھ لگی ہوں، اسناد کے ساتھ اپنی تالیفات میں درج کرتے تھے اور ان میں ہر قسم کی نظری دخالت سے پرہیز کرتے تھے۔

اس امر کے پیشِ نظر کہ آئمہ اہلبیتؑ تک دسترسی کا زمانہ بہت طولانی تھا جو تقریباً تین سو سال تک جاری رہا، فطری طور پر ان دونوں طبقوں کو زمانے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ آپس میں گھل مل گئے ہیں اور اسی طرح جو لوگ روایات و احادیث کو اسناد اور دستاویزات کے بغیر درج کریں بہت کم تھے۔ اس بارے میں نمونے کے طور پر تفسیر عیاشی کا نام لیا جا سکتا ہے کہ جس میں سے عیاشی کے ایک شاگرد نے ان کی تالیف میں سے حدیثیں سندوں اور دستاویزات کو اختصار کے باعث نکال دیا تھا اور اس کا تیار کردہ نسخہ عیاشی کے نسخے کی جگہ رائج ہو گیا تھا۔

طبقہ سوم: یہ گروہ اربابِ علومِ متفرقہ پر مشتمل ہے مثلاً سید رضی[3] اپنی ادبیت کے لحاظ سے، شیخ طوسی[4] کلامی تفسیر کے

---

[1] زرارہ اور محمد بن مسلم دونوں شیعہ فقیہ تھے، امام پنجم و ششم کے خاص اصحاب میں سے تھے معروف اور حریز امام ششم کے خاص اصحاب تھے۔

[2] فرات بن ابراہیم کوفی صاحبِ تفسیر ہیں (ریحانہ) ابو حمزہ ثمالی فقیہ اور امام چہارم و امام پنجم کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔

عیاشی محمد بن مسعود کوفی سمرقندی، امامیہ علماء میں سے ہیں جو تیسری صدی ہجری کے نصف دوم میں زندہ تھے۔ (ریحانہ)

علی بن ابراہیم قمی امامیہ محدثین میں سے تھے، تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں زندگی بسر کی۔ "

نعمانی محمد بن ابراہیم نعمانی اعلیٰ امامیہ علماء اور شیخ کلینی کے شاگردوں میں سے تھے، چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں زندہ تھے۔ "

[3] سید رضی اعلیٰ امامیہ فقہاء میں سے ہیں جو شعر و ادب کے لحاظ سے اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ نہج البلاغہ ان کی تالیف ہے۔ آپ نے ۴۰۴ھ یا ۴۰۶ھ میں وفات پائی۔ "

[4] شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی جو ممتاز امامیہ علماء میں سے ہیں، "کتاب تہذیب" اور "کتاب استبصار" جو کہ چار مستند شیعہ امامیہ کتابوں میں سے ہیں ان کی تالیفات ہیں۔ ۴۶۰ھ میں فوت ہوئے۔ "

لحاظ سے جو تفسیر تبیان کے نام سے مشہور ہے اور صدر المتاھلین[1] شیرازی اپنی فلسفی تفسیر کے لحاظ سے، میبدی[2] گوناآبادی اپنی عرفانی تفسیر کے لحاظ سے، شیخ عبد علی حویزی، سید ہاشم بحرانی، فیض کاشانی تفسیر نورالثقلین میں، برہان اور صافی وغیرہ جنہوں نے بعض دوسری تفاسیر میں سے علوم جمع کئے ہیں، شیخ طبرسی[3] اپنی تفسیر مجمع البیان میں، جس میں انہوں نے لغت، نحو، قرأت، کلام اور حدیث وغیرہ کے لحاظ سے بحث کی ہے۔

۱۸ــــ خود قرآن مجید کیسی تفسیر قبول کرتا ہے ـــ ؟

اس سوال کا جواب گزشتہ ابواب سے معلوم ہو جاتا ہے، کیونکہ:

ایک طرف تو قرآن مجید ایسی کتاب ہے جو عمومی اور ہمیشگی ہے اور تمام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے اپنے مقاصد کی طرف راہنمائی اور ہدایت کرتی ہے۔ اس طرح سب انسانوں کو چیلنج کرتی ہے (کہ اس طرح کی کتاب لا کر دکھاؤ) اور اپنے آپ کو "نور" "نورانی کرنے والی" اور "ہر چیز کو واضح بیان کرنے والی کتاب" کہہ کر تعارف کراتی ہے۔ البتہ اپنے روشن اور واضح ہونے میں دوسروں کی محتاج نہیں ہے۔

قرآن مجید یہ بھی چیلنج کرتا ہے کہ یہ ایک انسان کا کلام نہیں ہے، اور فرماتا ہے[4]: "قرآن یکساں کلام ہے جس میں کسی قسم کا فرق نہیں (اس کی آیات میں) اور جو فرق ظاہری طور پر لوگوں کو نظر آتا ہے، وہ لوگ اگر قرآن میں غور

---

[1] صدر المتاھلین محمد بن ابراہیم شیرازی مشہور فیلسوف تھے۔ آپ نے ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کی تالیفات میں "اسرار الآیات" اور "مجموعہ تفاسیر" شامل ہیں۔ (روضات اور ریحانہ)

[2] میبدی گوناآبادی، سید ہاشم بحرانی (صاحب برہان، چار جلدوں میں۔ متوفی ۱۱۰۷ھ) فیض کاشانی، اخوند ملا محسن جنہوں نے تفسیر صافی اور اصفیا لکھی (متوفی ۱۰۹۱ھ) (ریحانہ)

[3] فضل بن حسن طبرسی اہم شیعہ علماء میں سے ہیں جو صاحب تفسیر "مجمع البیان" ہیں۔ یہ تفسیر ۱۰ جلدوں میں ہے۔ آپ نے ۵۴۸ھ میں وفات پائی۔

[4] سورہ نساء۔ آیت ۸۲۔

و فکر اور تدبّر کریں تو حل ہو جاتا ہے اور اگر (یہ قرآن) خدا کا کلام نہ ہوتا تو ہرگز اس قسم کا نہ ہوتا (اپنی حالت میں) اور اگر ایسا کلام اپنے مقاصد کے روشن ہونے میں کسی کمی، چیز یا آدمی کا محتاج ہوتا تو یہ دلیل اور برہان پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

کیونکہ اگر کوئی مخالف یا دشمن، ایسے اختلافی مسائل دریافت کرے جو خود قرآن کی لفظی دلالت کے ذریعے حل نہ ہوں اور کسی دوسرے غیر لفظی طریقے سے حل ہوں مثلاً پیغمبر اکرمؐ کی طرف رجوع کرنے سے حل ہو سکیں تو آنحضرتؐ قرآنی شواہد کے بغیر ہی ان کو حل کر دیں یعنی آیت کا مطلب ایسا اور یوں ہے تو اس صورت میں وہ مخالف شخص جو آنحضرتؐ کی عصمت اور صداقت کا معترف نہیں ہے، وہ ہرگز قانع اور مطمئن نہیں ہو سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں پیغمبر اکرمؐ کا بیان اور اختلافات کو حل کرنا اور وہ بھی قرآنی شہادت اور دلیل کے بغیر، تو وہ صرف ایسے شخص کے لئے مفید اور قابل قبول ہوگا جو نبوت اور آنحضرتؐ کی عصمت و پاکی پر ایمان رکھتا ہو، لیکن اس آیۂ شریفہ:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝ (سورہ نسا ۸۲)

تو ایک احتجاج اور ان لوگوں کی طرف اشارہ اور دعوت ہے جو نبوّت اور آنحضرتؐ کی عصمت و طہارت پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا آنحضرتؐ کا بیان جو قرآنی ثبوت کے بغیر ہو ان پر صادق نہیں آتا۔

دوسری طرف قرآن مجید خود پیغمبر اکرمؐ کے بیان اور تفسیر پر اور پیغمبر اکرمؐ اپنے اہلبیتؑ کی تفسیر پر گواہی اور شہادت دیتے ہیں۔

ان دو دیباچوں کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض آیات بعض دوسری آیات کے ساتھ مل کر تفسیر ہوتی ہیں اور پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے اہلبیتؑ کی حالت قرآن کے بارے میں معصوم معلموں اور استادوں جیسی ہے جو اپنی تعلیم میں ہرگز خطا نہیں کرتے لہٰذا جو تفسیر وہ کرتے ہیں وہ قرآن مجید کی آیات کو باہم ضم کر کے تفسیر کرنے سے کوئی فرق نہیں رکھتی۔

۱۹ نتیجہ بحث

وہ نتیجہ جو گزشتہ باب سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی حقیقی تفسیر وہ تفسیر ہے جو آیات میں غور و خوض اور ایک آیت کو دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں قرآنی آیات کی تفسیر کے لئے ہمارے سامنے تین طریقے ہیں:۔

۱۔ ایک آیت کی الگ تفسیر ان تمام علمی اور غیر علمی مقدموں کے ساتھ جو ہمارے سامنے موجود ہیں۔
۲۔ ایک آیت کی تفسیر روایات اور احادیث کی مدد سے کہ جو آیت کے ذیل میں ایک معصوم (پیغمبرؐ یا آئمہ اہلبیتؑ) سے ہم تک پہنچی ہیں۔
۳۔ آیت کی تفسیر تدبر اور غور و فکر کی مدد سے اور آیت کے معنی تمام مربوط آیات سے حاصل کرنا اور حتی الامکان روایات سے استفادہ کرنا۔

تیسرا طریقہ وہی ہے جس کے بارے میں پچھلے باب میں ہم نے نتیجہ اخذ کیا ہے اور وہ ایسا طریقہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے اہلبیتؑ اپنی تعلیمات میں اس کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: **وانّما انزل لیصدق بعضہ بعضاً** (ترجمہ) اور بیشک یہ آیات بعض دوسری آیات کی تصدیق میں آئی ہیں۔

اور امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: **ینطق بعضہ ببعض ولیشہد بعضہ علیٰ بعض**۔
ترجمہ: (قرآن مجید کی) بعض آیات بعض دوسری آیات کو بیان کرتی ہیں اور بعض آیات بعض دوسری آیات کے بارے میں شہادت دیتی ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اس طریقے کے مخالف ہے جو مشہور حدیث نبویؐ: **من فسر القرآن برأیہ فلیتبوّء مقعدہ من النار** (ترجمہ) جو شخص اپنے عقیدے اور نظریئے کے ساتھ قرآن کی تفسیر کرتا ہے وہ اپنا مکان آگ میں بناتا ہے ـــ کے مطابق اپنے عقیدے سے قرآن کی تفسیر سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس طریقے میں قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کی آیات سے ہوتی ہے نہ کہ مفسّر کی اپنی رائے اور عقیدے کے ساتھ۔

پہلا طریقہ قابل اعتبار نہیں ہے اور حقیقت میں تفسیر اپنی مرضی اور رائے کے مطابق ہے مگر یہ کہ تیسرے طریقے کے ساتھ مطابقت کرے۔

دوسرا طریقہ قابل اعتبار نہیں ہے جو علمائے اسلام اوائل اسلام میں انجام دیتے تھے اور صدیوں تک رائج رہا اور اس پر عملدرآمد ہوتا رہا (جیسا کہ گزشتہ ابواب میں ذکر کیا گیا ہے) اور اب تک اہلسنّت کے مفسّرین میں جاری اور رائج ہے۔
یہ طریقہ لامحدود ضرورتوں کے مقابلے میں بہت محدود ہے کیونکہ چھ ہزار کچھ سو قرآنی آیات میں ہمارے لئے سینکڑوں اور ہزاروں علمی اور غیر علمی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں ان سوالات اور مشکلات کا حل کہاں سے حاصل کرنا چاہیئے؟
آیا روایات اور احادیث کی طرف رجوع کرنا چاہیئے؟ اس صورت میں ایسی روایات اور احادیث جن کی تعداد ۲۵۰

احادیث تک بھی نہیں پہنچتی، سب کی سب اہلسنّت کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں اور ان میں بہت سی حدیثیں ضعیف ہیں اور بعض دوسری منکر ہیں (یعنی جن سے انکار کیا جا سکتا ہے) اور ایسی احادیث جو شیعہ ذریعوں اور اہلبیتؑ کی زبانی ہم تک پہنچی ہیں، اگر ان کو نظر میں رکھیں تو ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان کے درمیان بہت زیادہ احادیث قابلِ اعتبار مل سکتی ہیں لیکن بہرحال لامحدود سوالات کا جواب دینے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بہت زیادہ قرآنی آیات بھی ہیں جن کے متعلق خاص اور عام طریقوں سے کوئی حدیث نہیں ملتی۔

آیا ان مشکلات کو حل کرنے کیلئے ان کو مناسب آیات کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو اس طریقے میں ممنوع ہیں؟ یا بحث سے بالکل پرہیز کرنا چاہئے اور اپنی علمی ضرورت سے چشم پوشی کر لینی چاہئے؟ اس صورت میں آیہ شریفہ:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ نحل آیہ ۸۹)

ترجمہ: ہم نے تم پر یہ کتاب (قرآن) نازل کی تاکہ ہر چیز کی حقیقت کو واضح کرے یعنی حق کو باطل سے جدا کرے۔

آفتاب سے زیادہ روشن دلیل کے کیا معنی ہونگے؟ اور آیہ شریفہ: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (سورہ نسا آیہ ۸۲ اور سورہ محمد آیہ ۲۴) اور آیہ شریفہ كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ○ (سورہ ص: آیت ۲۹) ترجمہ: یہ کتاب بہت مبارک ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، اس لئے کہ اس کی آیات میں غور کریں اور صاحبِ عقل لوگ اس کو بیان کریں۔ اور آیہ شریفہ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ○ (مومنون ۶۸) ترجمہ: آیا انہوں نے اس بیان پر غور نہیں کیا ہے یا ان کی طرف کوئی نئی چیز نازل ہوئی ہے جو ان کے آباء و اجداد کی طرف پہلے کبھی نازل نہیں ہوئی ہے جو ان کے آباء و اجداد کی طرف پہلے کبھی نازل نہیں ہوئی تھی ــــ ان آیات کے معنی کیا ہوں گے؟

مسلّمہ احادیث جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں اور لوگوں کو ان (پر غور و فکر کرنے) کی تاکید اور وصیّت کی گئی ہے کہ مشکلات اور اختلافات پیش آنے پر قرآن مجید کی طرف رجوع کریں، ان کا اثر کیا ہوگا؟

بنیادی طور پر اس طریقے کی بناء پر قرآن پر غور و فکر کرنے کا مسئلہ جو متعدد آیات کے مطابق ایک عمومی فرض ہے، کیا اس کے کچھ معنی نہیں ہیں؟

اسی طرح عام طریقے سے پیغمبر اکرمؐ کی احادیث ہیں، اور خاص طریقے سے "اخبارِ متواتر" جو پیغمبر اکرمؐ اور

آئمہ اہلبیتؑ کی طرف سے احادیث کو کتاب اللہ (قرآن) کی طرف رجوع کرنے میں فرض ہوا ہے، ان احادیث کے مطابق حدیث کو قرآن مجید کے مطابق ہونا چاہئے، اگر مطابقت کرے تو اس پر عمل ہونا چاہئے اگر مخالف ہو تو اس کو رد کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ ان احادیث کا مضمون اسی وقت ٹھیک ہو گا جب قرآنی آیات اپنے مدلول (معنی) پر دلالت کرتی ہو اور اس مدلول کا ماحصل، جو حقیقت میں آیت کی تفسیر ہے، قابل اعتماد ہو، اور اگر ایسا ہو کہ آیت کے معانی کے ماحصل یعنی تفسیر کو خود حدیث تشکیل دے (کہ ٹھیک ہے یا نہیں) تو اس صورت میں کتاب (قرآن) کی طرف رجوع کرنے اور حاصل شدہ معانی ٹھیک اور صحیح نہیں ہوں گے۔

یہ احادیث بہترین گواہ ہیں کہ قرآن مجید کی آیات کی آیات پورے کلام کی طرح معنی پر دلالت کرتی ہیں اور روایات کے علاوہ بھی مستقل طور پر حجت ہیں۔

پس جو چیز گزشتہ مباحث سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مفسّر کا فرض یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ کی ان احادیث پر غور و خوض کرے جو قرآن مجید کی تفسیر میں داخل ہوئی ہیں اور ان کے طریقوں سے آشنا ہو۔ اس کے بعد قرآن و سنّت کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر کرے اور ان احادیث و روایات کو جو آیت کے مضمون کے مطابق ہوں، صرف انہی پر عمل کرے۔

۲۰ ــــ قرآن کے ساتھ قرآن کی تفسیر کا نمونہ

خداوند تعالیٰ اپنے کلام میں کئی جگہ فرماتا ہے: اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيءٍ (سورہ زمر ۶۲) ترجمہ: ہر چیز کا خالق خدا ہے۔ جس چیز کو شے یا چیز کہا جاتا ہے وہ خدا کے علاوہ ہے۔ یہی مضمون قرآن مجید میں چار بار آیا ہے اور اس کے بموجب جو چیز بھی دنیا میں مخلوق فرض کی جائے وہ خدا نے ہی پیدا کی ہے اور اس کی زندگی بھی خدا سے وابستہ ہے۔

البتہ اس نکتے کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ قرآن مجید سینکڑوں آیات میں علّت اور معلول کی تصدیق کرتا ہے اور ہر فاعل کے فعل کو خود اس کے فاعل سے نسبت دیتا ہے۔ چیزوں کے اثرات کو مثلاً آگ کے جلانے، زمین کے اگانے، آسمان سے بارش برسانے اور ایسے ہی دوسرے اعمال جو انسان کے اختیاری فعل ہیں انکو انسان سے منسوب کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہر کام کو انجام دینے والا شخص اس کام کا صاحب یا مالک ہے لیکن زندگی دینے والا اور

ہر چیز کو وجود میں لانے والا، حقیقی صاحبِ کار صرف خدا ہی ہے اور بس۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق اور آفرینش کو عمومیت دینے کے بعد فرماتا ہے: اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ (سورہ السجدہ۔ آیہ ۷) ترجمہ: وہ خدا جس نے ہر چیز کو بہت ہی خوبصورت پیدا کیا، مندرجہ بالا آیت کے انضمام کے مطابق زیبائی کے علاوہ اور کوئی صفت نہیں رکھتیں (ہر چیز زیبا اور خوبصورت ہے)

اور اس نکتے سے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن مجید بہت زیادہ آیات میں خیر (نیکی) کو شر (برائی) کے مقابلے میں، اور نفع کو نقصان کے مقابلے میں اور اسی طرح نیک کو بد کے مقابلے میں اور خوبصورت کو بدصورت کے مقابلے میں تصدیق کرتا ہے اور بہت سے کاموں، مظاہر قدرت کو اچھا اور برا کہہ کر پکارتا ہے لیکن حقیقت میں یہ برائیاں، بدیاں اور ناگواریاں، آپس میں مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا ان کا وجود قیاسی اور نسبی ہے نہ کہ نفسی (ذاتی)۔

مثلاً سانپ اور بچھو برے جانور ہیں لیکن انسانوں اور حیوانات کی نسبت جن کو ان کے ڈنگوں سے نقصان پہنچتا ہے نہ کہ پتھر اور خاک کی نسبت، تلخ مزہ اور مردار کی بدبو قابلِ نفرت ہیں لیکن انسان کے ذائقے اور سونگھنے کی نسبت سے نہ کہ کسی دوسری یا ہر چیز کی نسبت بعض اخلاق اور کردار بھی برے ہیں لیکن انسانی سوسائٹی کے نظام کی نسبت، نہ کہ ہر نظام کی نسبت سے اور نہ ہی اجتماعی نظام سے الگ ہو کر۔

ہاں تو اگر مقابلے اور نسبت سے چشم پوشی کر لی جائے تو اس صورت میں ہر چیز، جس چیز کو بھی دیکھیں گے، خوبصورتی، زیبائی، حیرت انگیز اور چندھیا دینے والے عجیب کرشموں کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا اور جہانِ ھستی کا خوبصورت جلوہ انسانی بیان اور تعریف سے باہر ہے کیونکہ خود تعریف اور بیان بھی جہانِ ھستی میں سے ہیں۔

درحقیقت آیۂ مذکورہ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو برائیوں اور بدصورتیوں سے ہٹا کر صرف خوبیوں اور اچھائیوں کی طرف مائل کرے اور کلی اور عمومی طور پر ذہنوں کو آراستہ کر دے۔

اس تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد ہم سیدکڑوں قرآنی آیات کو مشاہدہ کرتے ہیں کہ اپنے گوناگوں بیانات کے ذریعے جہانِ ھستی کی موجودات کو الگ الگ، دستہ دستہ، گروہ گروہ، جزئی اور کلی نظاموں کو، جن کے مطابق وہ حکومت کرتے ہیں، خداوند تعالیٰ کی نشانیوں اور آئینوں کے طور پر تعارف کراتی ہیں اور اگر ان پر گہرے طور پر غور و فکر کریں، تو وہ اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھانے والی ہیں۔

گزشتہ دو آیتوں کے پیش نظر ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیرت انگیز زیبائی اور خوبصورتی جو تمام جہانِ ھستی کو دو طرف سے گھیرے ہوئے ہے وہی خدائی زیبائی جو آسمانی اور زمینی آیتوں (نشانیوں) کے ذریعے مشاہدہ ہوتی ہے اور اس دنیا کے تمام اجزاء ایک ایسا دریچہ ہیں جن سے دلنشین اور لامتناہی فضا باہر نکلتی ہے لیکن یہ اجزا خود بخود کوئی چیز نہیں ہیں۔

اس طرح قرآن مجید دوسری آیات میں ہر کمال اور جمال کو خداوند کریم سے متعلق شمار کرتا ہے، جیساکہ فرماتا ہے:

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ (سورہ مؤمن آیہ ۶۵) ترجمہ: وہ (خدا) زندہ ہے اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔

أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (سورہ بقرہ آیہ ۱۶۵) ترجمہ: تمام قوت اور طاقت خدا کی ہے۔ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (سورہ نساء آیہ ۱۳۹) ترجمہ: حقیقت میں سب عزتیں خدا کو جچتی ہیں۔

وَهُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ (سورہ الروم آیہ ۵۴) هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (سورہ الاسراء آیہ ۱)

اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ○ (سورہ طہ آیہ ۸) ترجمہ: خدا وہ ہے جس کے بغیر اور کوئی خدا نہیں ہے۔ ہر اچھا نام اسی کا ہے۔ ان آیات کے مطابق تمام خوبصورتیاں جو اس جہانِ ہستی میں موجود اور جلوہ گر ہیں، ان سب کی حقیقت خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہے لہٰذا دوسروں کے لئے صرف مجازی اور عاریت ہیں۔

اس بیان کی تائید میں قرآن مجید ایک اور بیان کے ذریعے وضاحت کرتا ہے کہ دنیا کے ہر مظہر میں جمال اور کمال محدود اور متناہی ہیں اور خداوند تعالیٰ کے لئے نامحدود اور غیر متناہی: إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ○ (سورہ قمر آیہ ۴۹) ترجمہ: ہم نے ہر چیز کو ایک خاص اندازے کے ساتھ خلق کیا ہے۔ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ ○ (سورہ حجر آیہ ۲۱) ترجمہ: ہر چیز ہمارے سامنے ایک خزانہ ہے، ہم اس خزانے کو بغیر ایک معین اندازے کے زمین پر نہیں بھیجتے۔

انسان اس قرآنی حقیقت کو قبول کرنے سے اچانک اپنے آپ کو ایک لامتناہی جمال اور کمال کے سامنے دیکھے گا کہ ہر طرف سے اس کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کے مقابلے میں کسی قسم کا خلا موجود نہیں ہے اور ہر جمال و کمال اور حتیٰ کہ اپنے آپ کو جو کہ خود انہی آیتوں (نشانیوں) میں سے ایک ہے، بھول کر اسی (خدا) کا مجذوب اور عاشق ہو جائے گا۔

جیساکہ فرماتا ہے: وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (سورہ بقرہ آیہ ۱۶۵) ترجمہ: جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں وہ خدا کی نسبت زیادہ مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ چونکہ مہر و محبت کا خاصہ ہے اپنے استقلال اور ارادے کو خدا کے سامنے تسلیم کرتے ہوئے خدا کی کامل سرپرستی کے تحت چلا جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۶۸) ترجمہ: خدا مومنوں کا سرپرست اور والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی جیسا کہ وعدہ فرمایا ہے، خود انسانوں کی رہبری اور قیادت کرتا ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (سورہ بقرہ ۲۵۷) ترجمہ: خدا مؤمنوں کا سرپرست ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

اور اس آیۂ کریمہ کے موجب: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ (سورہ انعام آیہ ۱۲۲) ترجمہ: آیا وہ شخص جو مر گیا تھا ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کو نور اور روشنی دکھائی کہ وہ اس روشنی کے ساتھ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ اور آیہ شریفہ: اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (سورہ مجادلہ ۲۲) ترجمہ: اور خدا نے ان کے دلوں میں ایمان کو قائم اور ثابت کر دیا ہے اور ان کو اپنی روح یا ایمان سے مدد دی ہے۔ ان کو ایک نئی روح اور نئی زندگی بخشتا ہے اور ایک نور یعنی خاص حقیقت بینی کا ملکہ اس کو عطا کر دیتا ہے تاکہ سعادت مندانہ زندگی کو معاشرے میں تشخیص دے۔

اور دوسری آیہ شریفہ اس نور کو حاصل کرنے کے بارے میں وضاحت کرتی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (سورہ حدید ۲۸) ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، پرہیزگار بنو اور خدا کے پیغمبر پر ایمان لاؤ تاکہ خداوند تعالیٰ اپنی رحمت سے دوگنا حصہ تمہیں دے اور تمہارے لئے نور لائے تاکہ تم اس نور کے ساتھ راہ پر چلو۔

اور پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے کو دوسری آیات میں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورہ آل عمران ۳۱) ترجمہ: اے پیغمبرؐ کہہ دو کہ اگر تمہیں خدا سے محبت ہے تو میری اطاعت کرو تاکہ

خدا تم سے محبت کرے۔ پیروی اور اطاعت کی بنیاد ایک دوسری آیۂ شریفہ میں وضاحت فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (سورہ اعراف آیہ ۱۵۷)

ترجمہ: جو لوگ اس پیغمبر کی اطاعت اور پیروی کرتے ہیں جو اُمّی ہے اور جو کوئی تورات اور انجیل میں لکھے ہوئے ثبوت کو پیدا کرنا چاہتا ہے، تورات اور انجیل میں بھی اس (پیغمبر) کا ذکر آیا ہے۔ ان کو اچھی باتوں کی طرف دعوت دیتا ہے اور بُری باتوں سے منع کرتا ہے اور اسی طرح پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال اور ناپاک اور پلید چیزوں کو ان کے لئے حرام کرتا ہے اور ان سختیوں اور ہر قسم کی پابندیوں کو دور کرتا ہے یعنی ان کو آزادی بخشتا ہے۔

پیروی اور اطاعت کے بارے میں اس سے بھی واضح تر بیان ایک اور آیہ شریفہ میں جو پہلی آیت کی مفسّر بھی ہے توضیح دیتا ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (سورہ روم آیہ ۳۰)

ترجمہ: اپنے چہرے کو مضبوط رکھو دین کے لئے، اعتدال کی حالت میں رہو۔ دین میں اعتدال کے ساتھ ثابت قدم رہو، یہ خدا کی فطرت ہے جس پر انسانوں کو خلق کیا گیا ہے (اسی پر ثابت قدم رہو) خدا کی فطرت میں کوئی تبدیلی اور تغیّر و تبدّل نہیں ہے، یہی وہ دین ہے جو انسانی معاشرے کا بخوبی انتظام کر سکتا ہے۔

اس آیۂ شریفہ کے مطابق اسلام کا مکمل پروگرام فطرت کے تقاضوں پر مبنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسی شریعت اور قوانین ہیں جن کی طرف انسانی فطرت رہنمائی کرتی ہے (یعنی ایک قدرتی اور فطری انسان کی فطری زندگی تمام آلائشوں سے پاک ہو) جیسا کہ ایک جگہ فرماتا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (سورہ شمس آیہ ۷-۱۰)

ترجمہ: مجھے قسم ہے انسانی نفس کی جو اپنے کمال میں خلق کیا گیا ہے لیکن اس کو شر کا الہام بھی دیا گیا ہے۔ ان آیات کی قسم جس نے اپنے نفس کو گناہوں سے پاک رکھا یقیناً نجات پیدا کرے گا اور جس نے نفس کو پلیدی اور گناہوں

سے آلودہ کیا وہ یقیناً گھاٹے میں رہے گا۔

قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو سب سے پہلے انسانی سعادت مندانہ زندگی کو ایک فطری اور پاک انسان کی بے لاگ زندگی کے مساوی سمجھتی ہے اور دوسرے تمام یا بیشتر طریقوں کے خلاف جو انسان کی خدا پرستی (توحید) کے پروگرام کو زندگی کے پروگرام سے جدا اور الگ کرتے ہیں، دین کے پروگرام کو ہی زندگی کا پروگرام کہتی ہے اور اس طرح انسان کے تمام انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں میں مداخلت کرتے ہوئے حقیقت بینی پر مبنی (جہان بینی، خدا پرستی و توحید) احکام کو جاری کرتی ہے اور دراصل افراد کو دنیا اور دنیا کو افراد کے سپرد کر دیتی ہے اور دونوں کو خدا کے سپرد۔

قرآن مجید خدا کے بندوں اور اولیاء اللہ کے لئے ان کے یقین و ایمان کے مطابق بہت زیادہ صوری اور معنوی خواص کا ذکر کرتا ہے کہ اس باب میں ان کی تفصیل سما نہیں سکتی۔

۲۱۔ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کے بیانات کی حجّت کے معانی

قرآن مجید کے اپنے ثبوت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے اہلبیت محترمؑ کا بیان جیسا کہ گزشتہ ابواب میں آیا ہے قرآنی آیات کی تفسیر میں حجت رکھتا ہے۔ یہ حجت پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہلبیتؑ کی زبانی واضح بیان کے متعلق ہے اور ایسے ہی احادیثِ قطعیۃ الصدور میں ان کے بیانات واضح طور پر آئے ہیں لیکن غیر قطعی حدیث جس کو اصطلاح میں "خبرِ واحد" کہتے ہیں اور اس کا ثبوت مسلمانوں کے درمیان مختلف ہے، وہ اس شخص کی رائے پر مبنی ہے جو قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔ اہلسنت کے درمیان ایک طور سے "خبرِ واحد" جس کو "حدیث صحیح" کہا جاتا ہے اس پر مکمل طور پر عمل کرتے ہیں اور شیعوں کے درمیان جس چیز کو، جو اب علم اصول کے ذریعہ تقریباً ثابت اور مسلّم ہے یہ ہے کہ "خبر واحد" جو قابلِ اعتماد طریقے سے جاری ہوئی ہو احکامِ شرعی میں حجّت ہے اور اگر اسکے خلاف ہو تو اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے پر تحقیق کرنے کیلئے علم اصول کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

نوٹ: اس بناء پر کہ تفسیر کے معنی آیت سے حاصل شدہ معنی ہی ہیں اور اس بحث کو "تفسیری بحث" بھی کہا جاتا ہے۔ آیت کے حاصل شدہ معنی میں تاثیر رکھتی ہو، لیکن وہ بحثیں جو آیت سے حاصل شدہ معنی میں اثر نہیں رکھتیں مثلاً بعض لغوی، قرأتی اور بدیعی مباحث وغیرہ۔ اس قسم کی بحثیں قرآن کی تفسیر نہیں ہو سکتیں۔

باب سوم

ا ــ قرآن مجید کی وحی کے بارے میں مسلمانوں کا عام اعتقاد۔

ب ــ وحی اور نبوت کے بارے میں موجودہ لکھنے والوں کی رائے۔

ج ــ خود قرآن مجید اس بارے میں کیا فرماتا ہے۔؟

۱ ــ کلام خدا۔ ۲ ــ جبریل اور روح الامین۔

۳ ــ فرشتے اور شیاطین۔ ۴ ــ ضمیر کی آواز۔

۵ ــ دوسری وضاحت کے متعلق۔

د ــ خود قرآن مجید وحی اور نبوت کے بارے میں کیا فرماتا ہے؟

ا ــ عام ہدایت اور انسانی ہدایت۔ ۲ ــ راہِ زندگی طے کرنے میں انسانی امتیازات۔

۳ ــ انسان کس لحاظ سے اجتماعی ہے؟ ۴ ــ اختلافات کا پیدا ہونا اور قانون کی ضرورت۔

۵ ــ قانون کی طرف انسان کی ہدایت اور رہنمائی کرنے کے لئے عقل کافی نہیں ہے۔

۶ ــ انسانی ہدایت کا تنہا راستہ وحی ہے۔ ۷ ــ مشکلات اور ان کے جوابات۔

۸ ــ وحی کا طریقہ ہر طرح کی غلطی اور خطا سے مبرا ہے۔

۹ ــ ہمارے لئے وحی کی حقیقت مجہول اور نامفہوم ہے۔

۱۰ ــ وحی قرآن کی کیفیت۔

و۔ قرآن مجید کی وحی کے بارے میں مسلمانوں کا عام اعتقاد

قرآن مجید نے تمام دوسری الہامی اور مقدس کتابوں مثلاً تورات اور انجیل وغیرہ سے زیادہ آسمانی وحی ، وحی بھیجنے والے اور وحی لانے والے کے متعلق لکھا ہے اور حتیٰ کہ وحی کی کیفیت کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے۔

مسلمانوں کا عام عقیدہ، البتہ اس عقیدے کی بنیاد وہی قرآن مجید کا ظاہری پہلو ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ ہے کہ قرآن مجید اپنے بیان کے مطابق خدا کا کلام ہے جو ایک مقرب فرشتے کے ذریعے، جو آسمانی مخلوق ہے، پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوا ہے۔

اس فرشتے کا نام "جبرئیل اور روح الامین" ہے جس نے خداوند تعالیٰ کے کلام کو بتدریج تئیس سال کے عرصے میں پیغمبر اکرمؐ تک پہنچایا اور اس کے مطابق آنحضرتؐ کو مامور کیا کہ آیات کے الفاظ و معانی لوگوں کے سامنے تلاوت کریں اور ان کے مضامین و مطالب لوگوں کو سمجھائیں اور اس طرح جن اعتقادی معارف، اجتماعی اور مدنی قوانین اور انفرادی فرائض کا قرآن مجید ذکر کرتا ہے، اس کی طرف دعوت دیں۔

اس خدائی مشن کا نام پیغمبری اور رسالت ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اس دعوت میں بغیر کسی دخل و تصرف، کمی بیشی اور پس و پیش کے، اپنی رسالت کو انجام دیا ہے۔

ب۔ وحی اور نبوت کے بارے میں موجودہ لکھنے والوں کی رائے

اکثر موجودہ دور کے مصنفین اور لکھنے والے جو مختلف مذاہب اور ادیان کے متعلق تحقیق میں مشغول ہیں، ان کی رائے میں قرآنی وحی اور نبوت کی وضاحت یوں ہے :

پیغمبر اکرمؐ معاشرے کے بہت ہی ذہین انسان تھے جو انسانی معاشرے کو انحطاط، وحشت گری اور زوال سے بچا کر اس کو تمدن اور آزادی کے گہوارے میں جگہ دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے تاکہ معاشرے کو اپنے پاک اور بے آلائش افکار کی طرف یعنی ایک جامع اور مکمل دین کی طرف، جو آپ نے خود مرتب کیا تھا، دعوت دیں۔

کہتے ہیں کہ آپ بلند ہمت اور پاک روح کے مالک تھے اور ایک تیرہ و تاریک ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے

جس میں سوائے زبردستی، ظلم و ستم، جھوٹ اور ہرج و مرج کے علاوہ اور کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی، اور خود غرضی، چوری، غارت گری، دہشت گری اور دہشت گردی کے علاوہ اور کوئی چیز موجود ہی نہیں تھی

آپ ہمیشہ ان حالات سے سخت رنجیدہ خاطر رہتے تھے اور جب کبھی بہت تنگ آجاتے تھے تو لوگوں سے الگ ہو کر ایک غار میں جو "تہامہ" کے پہاڑوں میں تھی چند دنوں تک کنجِ عزلت میں گوشہ نشین ہو جاتے تھے اور آسمان، چمکتے ہوئے ستاروں، زمین، پہاڑ، سمندر اور صحرا وغیرہ جو فطرت نے گرانبہا اسباب بنائے ہوئے ہیں اور ان کو انسان کے اختیار میں دے رکھا ہے، ان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے تھے اور اس طرح انسانی غفلت اور نادانی پر افسوس کیا کرتے تھے جس نے انسان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا تاکہ گراں قیمت زندگی، سراپا خوش بختی اور کامیابی سے دور کر کے ان کو درندوں، چرندوں اور حیوانوں کی طرح پست زندگی گزارنے پر مجبور کر دے۔

پیغمبر اکرمؐ تقریباً چالیس سال تک اس حالت کو اچھی طرح سمجھتے رہے اور مصیبت اٹھاتے رہے، یہاں تک کہ چالیس سال کی عمر میں ایک بہت بڑا منصوبہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تاکہ انسان کو اس ناگفتہ بہ حالت سے نجات دلائیں جس کا نتیجہ حیرانی اور پریشانی، آوارگی، خود غرضی اور بے راہ روی تھا۔ اور وہ دینِ اسلام تھا جو اپنے زمانہ کی اعلیٰ ترین اور مناسب ترین حکومت تھی۔

پیغمبر اکرمؐ اپنے پاک افکار کو خدا کا کلام اور خدائی وحی تصوّر کرتے تھے کہ خداوند تعالیٰ آپؐ کی پاک فطرت روح کے ذریعے آپ سے ہمکلام ہوتا تھا اور اپنی پاک اور خیر خواہ روح کو جس سے یہ افکار نکلتے تھے آپؐ کے پاک دل میں جاگزیں ہو جاتے تھے اور اس کو "روح الامین، جبریل اور فرشتۂ وحی" کہتے تھے۔ کلی طور پر ایسی قوتیں جو دنیائے فطرت میں خیر اور ہر قسم کی خوش بختی کی طرف دعوت دیتی ہیں ان کو ملائکہ اور فرشتے کہا جاتا ہے اور وہ قوتیں جو شر اور ہر قسم کی بدبختی کی طرف لے جاتی ہیں ان کو شیاطین اور جن کہا جاتا ہے۔ اس طرح پیغمبر اکرمؐ نے اپنے فرائض کو نبوّت اور رسالت کا نام دیا، جو ضمیر کی آواز کے مطابق تھے اور ان کے مطابق انسانوں کو انقلاب کی دعوت دیتے تھے۔

البتہ یہ وضاحت ان لوگوں کی ہے جو اس جہانِ ہستی کے لئے ایک خدا کے عقیدے پر قائم ہیں اور انصاف کی رُو سے اسلام کے دینی نظام کے لئے اہمیّت کے قائل ہیں، لیکن وہ لوگ جو اس دنیا کے لئے کسی

خالق کے معتقد نہیں ہیں وہ نبوّت، وحی، آسمانی فرائض، ثواب، عذاب، بہشت اور دوزخ جیسی تنظیمات کو دینی سیاست اور دراصل مصلحت آمیز جھوٹ سمجھتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اصلاح پسند انسان تھے اور انہوں نے دین کی صورت میں انسانی معاشرے کی اصلاح اور بہتری کے لئے قوانین بنائے اور چونکہ گزشتہ زمانے کے لوگ جہالت اور تاریکی میں غرق اور توہّم پرست تھے لہذا پیغمبروں نے دینی نظم و نسق کو توہّم پرستی پر مبنی اعتقادات کے سائے میں مبداء اور معاد کو محفوظ رکھا ہے۔

ج — خود قرآن مجید اس بارے میں کیا فرماتا ہے؟

جو لوگ وحی اور نبوّت کی تنظیم کو گزشتہ بیان کے مطابق توجیہہ کرتے ہیں وہ ایسے دانشور ہیں جو مادی اور طبیعیاتی علوم کے ساتھ دلچسپی اور محبت رکھتے ہوئے جہانِ ہستی کی ہر ایک چیز کو فطری اور قدرتی قوانین کی اجارہ داری میں خیال کرتے ہیں اور آخری گروہ حوادث کی بنیاد کو بھی فطری فرض کرتا ہے۔ اس لحاظ سے مجبوراً آسمانی مذاہب اور ادیان کو بھی اجتماعی مظاہر سمجھیں گے اور اس طرح تمام اجتماعی مظاہر سے جو نتیجہ حاصل ہوگا اس پر ہی پرکھیں گے۔ چنانچہ اگر اجتماعی تواریخ (ذہینِ انسان) میں سے کوئی ایک مثلاً کوروش، داریوش، سکندر وغیرہ اپنے آپ کو خدا کی طرف سے بھیجا ہوا اور اپنے کاموں کو آسمانی مشن، اور اپنے فیصلوں کو خدائی فرمان کے طور پر تعارف کرائیں تو گزشتہ باب میں آنے والی بحث کے علاوہ اور کوئی توجیہہ نہیں ہو سکے گی۔

ہم اس وقت یہاں دنیائے ماوراء الطبیعت کو ثابت کرنا نہیں چاہتے اور ان دانشوروں کو بھی نہیں کہتے کہ ہر علم صرف اپنے ارد گرد کے موضوعات پر ہی رائے دے سکتا ہے اور مادی علوم جو مادّے کے آثار اور خواص سے متعلق بحث کرتے ہیں وہ یقینی یا غیر یقینی طور پر ماوراء میں مداخلت کا حق رکھتے ہیں۔

یہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ گزشتہ توجیہہ جو بھی ہو وہ قرآن مجید کے بیانات جو پیغمبر اکرمؐ کی نبوت اور رسالت کی سند ہے اور اس تمام کلام کی اصلی بنیاد بھی ہے، اس سے مطابقت کرے لیکن قرآن مجید واضح طور پر بھی اس توجیہہ کے خلاف دلالت کرتا ہے اور ہم اب اس توجیہہ کے ہر ایک جزء کو قرآنی آیات کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔

۱۔ **کلام خدا** — گزشتہ وضاحت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کے ذہن میں جو پاک افکار جنم لیتے تھے ان کو خدا کا

کلام کہتے تھے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ افکار، دوسرے افکار کی طرح آپ کے ذہن سے نکلتے تھے لیکن چونکہ یہ افکار پاک اور مقدس تھے لہٰذا ان کو خدا سے منسوب کیا گیا تھا اور آخر کار پیغمبر اکرمؐ سے ظاہری اور فطری طور پر منسوب یہ افکار خداوند تعالیٰ سے معنوی طور پر منسوب ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید واضح اور سنجیدہ طریقے سے دعویٰ کرنے والی آیات میں اپنی عبارات کو پیغمبر اکرمؐ یا کسی دوسرے شخص سے منسوب ہونے کی نفی کرتا ہے اور فرماتا ہے:

اگر یہ کلام انسانی کلام ہے تو جیسا کہ قرآن نے اعتقادی، اخلاقی، احکام، قصّوں، حکمت اور پند و نصائح کے بارے میں کہا ہے: اس[۱] طرح کا کلام بنا کر لائیں اور اس بارے میں جس جگہ سے چاہیں مدد حاصل کریں، اگر وہ اس کو نہیں سمجھ سکے کہ یہ خدا کا کلام ہے یا انسان کا۔ اور اگر جن و انسان[۲] آپس میں مل کر اس کام کے لئے تیار ہوں اور کمر ہمت باندھیں تو بھی قرآن کی مانند اور مثل ہرگز کلام نہیں لا سکیں گے۔

پھر فرماتا ہے[۳]: اگر تم یہ کہتے ہو کہ قرآن مجید محمدؐ کا کلام ہے تو اس صورت میں اس شخص کی طرف سے جو زندگی میں آپؐ کی مانند ہو مثلاً یتیم، ناتربیت یافتہ، ناخواندہ جس نے لکھنا بھی نہ سیکھا ہو اور جاہلیت کے ماحول میں پرورش پائی ہو، اس کتاب کی طرح ایک سورت یا چند سورتیں بنا کر لائیں۔

اس کے بعد خداوند تعالیٰ فرماتا ہے[۴]: ان قرآنی آیات میں جو تیئیس ۲۳ سال کے عرصے میں بتدریج نازل ہوئی ہیں اور ان میں کسی قسم کا اختلاف اور اسلوبِ بیان والفاظ اور معنی کے لحاظ سے کوئی تغیّر و تبدل موجود نہیں ہے۔ ان پر کیوں غور نہیں کرتے اور اگر خدا کے علاوہ یہ قرآن کسی اور شخص کا کلام ہوتا تو یقیناً نظام کے سامنے تسلیم ہو جاتا اور اس میں تبدیلیاں اور اختلافات ضرور ظاہر ہوتے۔

ظاہر ہے کہ یہ بیانات شریعت کی نسبت سازگار نہیں ہیں اور قرآن مجید انکو صرف خدا کے کلام کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید سینکڑوں آیات میں خارق العادت معجزات جو عام فطری نظام کے مطابق قابلِ تشریح نہیں ہیں، ثابت کرتا ہے کہ پیغمبر ان کے ذریعے اپنی نبوت کو ثابت کرتے تھے اور اگر نبوّت کا مطلب وہی ضمیر کی آواز

۱۔ سورہ یونس آیہ ۳۸۔ سورہ ہود آیہ ۱۳۔ ۲۔ سورہ بنی اسرائیل آیہ ۸۸۔

۳۔ سورہ بقرہ آیہ ۲۳۔ ۴۔ سورہ نساء آیہ ۸۲۔

اور آسمانی وحی یعنی پاک انسانی افکار ہو تو دلیل و برہان لانا اور معجزات سے مدد حاصل کرنے کے کچھ معنی ہی نہیں نکلتے۔

بعض مصنّفین ان واضح اور روشن معجزات کو تمسخر آمیز نیّت کے ساتھ تاویل کرتے ہیں لیکن ہر پڑھا لکھا انسان اگر ان کی تشریحات کی طرف توجّہ کرے تو اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہے گا کہ قرآن مجید کا مقصد اس کے برعکس ہے جو یہ دانشور تصوّر کرتے ہیں۔

یہاں ہمارا مطلب معجزے کے امکان اور اس کے خارق العادت ہونے یا قرآن مجید کی عبارات کی صحت کو ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید گزشتہ انبیاء مثلاً حضرت صالح ؑ، حضرت ابراہیم ؑ، حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ کے معجزات کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے اور جو قصّے قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ خارق العادت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، البتّہ ضمیر کی آواز کو ثابت کرنے کے لئے معجزات کو پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔

۲ ــــ روح الامین اور جبریل ؑ

گزشتہ توجیہہ کے مطابق پیغمبر اکرم ؐ اپنی پاک روح کو جو مصلحت بینی اور خیر اندیشی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، روح الامین اور اس کی تلقین کو وحی کہتے تھے، لیکن قرآن مجید اس عقیدے کی تائید اور تصدیق نہیں کرتا کیونکہ قرآن مجید آیات کو القاء کرنے والے (پیغمبر اکرم ؐ کے دل پر الہام نازل کرنے والے) کو جبریل کہتا ہے اور مندرجہ بالا توجیہہ کی بناء پر اس وجہ تسمیہ کا کوئی سبب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرہ ۹۷) ترجمہ: اے پیغمبر ؐ کہہ دو کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہے، وہی جبریل قرآن مجید کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کرتا ہے نہ کہ بغیر (خدا کے) حکم سے یا اپنی طرف سے۔

یہ آیۂ شریفہ یہودیوں[۱] کے سوالات کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو انہوں نے پیغمبر اکرم ؐ سے پوچھے تھے یعنی اس قرآن کو کون تم پر نازل کرتا ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا۔ جبریل ؑ۔ انہوں نے کہا۔ ہم جبریل کے دشمن ہیں کیونکہ ہم

---

[۱] درالمنثور حصہ اوّل صفحہ ۹۰ اور نورالثقلین حصہ اوّل صفحہ ۸۷-۸۹ وغیرہ۔

بنی اسرائیل قوم کے لئے وہی جبرئیل محدودیت لے کر نازل ہوا کرتا تھا اور چونکہ ہم اس کے دشمن ہیں اس لئے جو کتاب وہ لایا ہے ہم اس پر ایمان نہیں لا سکتے۔ اللہ تعالیٰ اس آیۂ شریفہ میں ان کا جواب دیتا ہے کہ جبرئیل تو قرآن کو خدا کے حکم سے پیغمبرؐ پر نازل کرتا ہے نہ کہ اپنی طرف سے اور آخرکار قرآن مجید خدا کا کلام ہے لہٰذا اس پر ایمان لانا چاہئیے کیونکہ یہ جبرئیل کا کلام نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہودی قوم ایک خدا سے دشمنی رکھتی تھی جو خدا کی طرف سے "وحی" پہنچانے کا ذمہ دار تھا اور حضرت کلیم اللہؑ اور حضرت محمدؐ سے بالکل جدا تھا۔ نہ ہی کلیم اللہؑ اور نہ ہی حضرت محمدؐ کی پاک روح کو اس میں دخل تھا۔

اور یہی قرآن جو اس آیۂ کریمہ میں قرآن مجید کو پیغمبر اکرمؐ کے دل پر نازل کرنے کو جبرئیل سے منسوب کرتا ہے، دوسری آیت میں روح الامین سے نسبت دیتا ہے نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (سورۂ شعرا آیہ ۱۹۴)
ترجمہ: قرآن کو روح الامین نے تمہارے دل پر نازل کیا ہے۔ ان دو آیات کے توافق سے معلوم ہوتا ہے کہ روح الامین سے مراد وہی جبرئیل ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں ایک اور جگہ وحی لانے والے کے بارے میں فرماتا ہے: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ (سورۂ تکویر آیہ ۱۹-۲۳)
ترجمہ: بیشک قرآن ایسا کلام ہے جس کو محترم سفیر جبرئیلؑ لایا، رسولِ محترمؐ کی طرف جو اس صاحبِ عرش یعنی خدا کے سامنے طاقت اور قدر و منزلت رکھتا ہے اور فرشتوں کے لئے قابلِ اطاعت ہے (فرشتے اس کی اطاعت کرتے ہیں) وہ امین ہے اور تمہارا سب کا دوست اور حامی۔ پیغمبر اکرمؐ دیوانہ، مجنون اور آسیب زدہ نہیں ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ وحی لانے والے کو اس نے اس وقت دیکھا جب وہ افق میں تھا۔

ایسی آیات اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ جبرئیلؑ خدا کے مقربوں اور نزدیکوں میں سے ہے اور خدا کے سامنے بہت طاقتور، صاحبِ قدر و منزلت، فرماں روا اور امین ہے۔

ایک اور جگہ انہیں مقربینِ عرش کے وصف میں جو ملائکہ کرام ہیں فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

(سورہ مومن آیہ ۷) ترجمہ: جو فرشتے تیرے خدا کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو عرش کے اردگرد ہیں اور اپنے خدا کے لئے حمد و ثنا اور تسبیح کرتے ہیں اور جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں (وہ فرشتے) ان کے لئے طلب مغفرت کرتے ہیں ۔ اس آیۂ شریفہ کے مطابق واضح ہے کہ مقرب فرشتے مستقل موجودات ہیں، وہ شعور رکھتے ہیں، ارادے کے مالک ہیں کیونکہ وہ اوصاف جو ان کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں یعنی خدا پر ایمان رکھنا، دوسروں کے لئے طلب مغفرت کرنا وغیرہ سوائے ایک مستقل وجود کے جو صاحب شعور و ارادہ ہو، سازگار نہیں ہے۔

اور پھر اپنی مقرب فرشتوں کے متعلق فرماتا ہے: لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ یہاں تک کہ فرماتا ہے: وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ (سورہ نساء آیہ ۱۷۲-۱۷۳)

ترجمہ: مسیح کبھی خدا کی بندگی اور اطاعت سے سرکشی اور نافرمانی نہیں کرتا اور نہ ہی مقرب فرشتے، اور جو کوئی اس کی بندگی سے سرکشی اور نافرمانی کرے، ان سب کو بہت جلد اپنے پاس جمع کرے گا۔ (یہاں تک کہ فرماتا ہے) اور لیکن جن لوگوں نے نافرمانی کی ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا، لہٰذا اس وقت خدا کے سوا ان کا کوئی سرپرست اور حامی و ناصر نہیں ہوگا۔

ظاہر ہے کہ مسیحؑ اور مقرب فرشتے اگرچہ گناہ نہیں کرتے لیکن اگر وہ گناہ کریں اور بندگی سے خلاف ورزی کریں تو اس آیۂ شریفہ کے مطابق ان کو قیامت کے دن سخت عذاب کی دھمکی دی گئی ہے لہٰذا قیامت کے دن عذاب کی دھمکی جو ترک ہونے کے علاوہ ایک فرض بھی ہے، استقلال وجود، شعور و ارادے کے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہو سکتا۔

گزشتہ آیات سے واضح ہوتا ہے کہ روح الامین جس کو جبریل بھی کہا جاتا ہے وحی کا لانے والا ہے قرآن کے بیان کے مطابق ایک آسمانی فرشتہ مکمل وجود، شعور اور ارادہ رکھتا ہے۔

بلکہ گزشتہ سورۂ تکویر کی آیت [۲۱] میں آنے والے فقرے مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (قرآن کو لانے والا اس فقرے میں مطاع ہے) سے مستفاد ہوتا ہے کہ جبریل عالم بالا میں فرماں روا ہے اور بعض فرشتے اس کے فرمان بردار اور مطیع ہیں۔ ہمیشہ یا کبھی کبھی اس کے ماتحتوں کے ذریعے بھی وحی آتی تھی جیسا کہ سورہ عبس کی آیات بھی اس

معنی پر دلالت اور اشارہ کرتی ہیں۔ کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ۝ (سورہ عبس آیہ ۱۱-۱۶)

ترجمہ: بلاشبہ یہ قرآن یا یہ آیات یاد دہانی ہیں۔ پس جو چاہے اس کو یاد کرے۔ یہ تذکرہ صحیفوں (الہامی کتابوں) میں بہت ہی گرامی، عزیز، بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہے اور محترم و نیکو کار سفیروں کے ہاتھ میں ہے۔

۳ — فرشتے اور شیطان

گزشتہ توجیہہ کے مطابق ملائک یا فرشتے فطری قوتوں کا نام ہے جو خیر، نیکی اور خوش قسمتی کے معنی رکھتے ہیں اور شیاطین ایسی فطری قوتوں کے نام ہیں جو شر، بدی اور بدبختی کی طرف دعوت کرتی ہیں لیکن جیسا کہ قرآن مجید سے مستفاد ہوتا ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے، کیونکہ قرآن مجید ملائک، فرشتوں اور شیاطین کو ایسی موجودات شمار کرتا ہے جو احساس، شعور اور ارادے سے عاری ہیں۔

لیکن فرشتے جیسا کہ گزشتہ آیات میں ان کے بارے میں ذکر ہوا ہے، کے بموجب فرشتے ایک مستقل موجودات ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور ان سے شعور و ارادے کے مطابق عمل سرزد ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیات ہیں کہ اس دعوے پر شہادت دیتی ہیں۔

لیکن شیاطین کا ماجرا، ابلیس کا حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے اور خدا اور ابلیس کے درمیان مباحثہ قرآن مجید میں کئی جگہ نقل ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مردود ہونے کے بعد کہتا ہے: "میں آدمؑ کی اولاد کو سوائے مخلص بندوں کے سب کو گمراہ کروں گا۔" لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝ (سورہ ص آیہ ۸۲-۸۳) اور خدائے تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے: "ہم دوزخ کو تم سے، تمہارے اعمال کے بدلے اور ان انسانوں سے پُر کر دیں گے جو تمہاری پیروی کریں گے۔" لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (سورہ ص آیہ ۸۵)

ظاہر ہے کہ اعمال کا بدلہ سزا پانے والے کے شعور، سمجھ اور ادراک کے بغیر نہیں دیا جاتا اور اسی طرح خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام میں ایک اور جگہ ابلیس کی طرف سے انسان کو دھمکی کے حوالے سے فرمایا ہے: وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ

اِبۡلِيۡسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوۡهُ اِلَّا فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○ (سورہ سبا آیہ ۲۰)

ترجمہ: "ابلیس ان کے متعلق جو گمان رکھتا تھا اس نے اس کو ثابت کر دیا، پس مومنوں میں سے ایک فرقے نے اس کی پیروی کر لی۔" جیسا کہ ظاہر خدا نے ابلیس کو ظن اور گمان سے متصف کیا ہے۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے: وَقَالَ الشَّيۡطٰنُ لَمَّا قُضِىَ الۡاَمۡرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمۡ وَعۡدَ الۡحَـقِّ وَوَعَدْتُّكُمۡ فَاَخۡلَفۡتُكُمۡ‌ؕ وَمَا كَانَ لِىَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّاۤ اَنۡ دَعَوۡتُكُمۡ فَاسۡتَجَبۡتُمۡ لِىۡ‌ۚ فَلَا تَلُوۡمُوۡنِىۡ وَلُوۡمُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ (سورہ ابراہیم آیہ ۲۲)

ترجمہ: "اور شیطان کام کے خاتمے کے بعد کہتا ہے، خدا نے تمہیں وعدہ دیا، وعدۂ حق۔ میں نے بھی وعدہ دیا لیکن خلاف ورزی کی اور مجھے تم پر تسلط نہیں تھا، سوائے اس کے کہ تمہیں صرف دعوت دی، اور تم نے اس کو قبول کر لیا۔ پس مجھے ملامت اور سرزنش نہ کرو بلکہ تم اپنے آپ کو ملامت کرو۔" ملامت اور سرزنش بھی ان امور میں سے ہے جو صرف ان سے تعلق رکھتی ہے جو شعور اور ارادہ رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات اور ایسے ہی دوسری آیات جو اسی موضوع کے بارے میں ہیں خداوند تعالیٰ شیطان کے لئے صفات اور حالات کو ثابت کرتا ہے جو مستقل وجود، شعور اور ارادے کے لئے ضروری ہیں اور یہ صفات ان فطری قوتوں پر صادق نہیں آتیں جو ان صفات سے عاری ہیں۔

جن، ملائک اور شیاطین کے بارے میں جو آیات لکھی گئی ہیں ان کی طرح بلکہ ان سے زیادہ واضح آیات جنوں کے بارے میں بھی ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان بیٹوں کے بارے میں جو اپنے ماں باپ کی دعوت قبول نہیں کرتے اور ایمان نہیں لاتے اور خدا کے دین کو تہمات اور گزشتہ قصّے کہانیاں کہتے ہیں فرماتا ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ حَقَّ عَلَيۡهِمُ الۡقَوۡلُ فِىۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ‌ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا خٰسِرِيۡنَ ○ (سورہ احقاف آیہ ۱۸) ترجمہ: "وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں بات ثابت ہو چکی ہے وہ لوگ امتوں میں سے ہیں لیکن جن و انس سے آگے بڑھ چکے ہیں اور وہ واقعی گھاٹے میں ہیں۔" اس آیت کے مطابق جن بھی انسانوں کی طرح مختلف فرائض رکھتے ہیں اور ان کو بھی موت آتی ہے۔

پھر ایک اور جگہ فرماتا ہے: وَاِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَيۡكَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (سورہ احقاف آیہ ۲۹-۳۲)

ترجمہ: میں یاد دہانی کراتا ہوں اس وقت کی جبکہ جنوں میں سے چند ایک کو قرآن سننے کے تمہاری طرف بھیجا، جب وہ حاضر ہوئے تو آپس میں کہتے تھے کہ سنو! پس جو نہی ختم ہوا تو وہ اپنی قوم کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ ان کو (اسلام کی) دعوت دیں۔ انہوں نے کہا۔ اے قوم! ہم نے ایسی کتاب کو سنا ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل ہوئی ہے اور حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اے قوم! تم خدا کی طرف دعوت کرنے والے کو قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ تاکہ خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے اور تمہیں دردناک عذاب سے بچائے اور جو کوئی دنیا میں خدا کی طرف دعوت دینے والے کو قبول نہ کرے گا تو وہ خدا کو عاجز نہیں کرسکتا کیونکہ دنیا میں خدا کے سوا کوئی سرپرست نہیں ہے لہٰذا جو لوگ خدا کو قبول نہیں کرتے وہ واضح طور پر گمراہی اور ضلالت میں ہیں۔

اس قصے کی واضح یہ ہے کہ جن بھی انسان کی طرح ایک ایسی جماعت ہیں جو مستقل وجود، شعور و ارادہ رکھتے ہیں، قرآن مجید میں دوسری آیات بھی ہیں جو قیامت کی نشانیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ وہ آیات بھی مندرجہ بالا آیات سے دلالت اور ثبوت میں کم درجہ نہیں رکھتیں۔

۴۔ ضمیر کی آواز

گزشتہ توجیہہ کے مطابق نبوت اور رسالت کے معنی "ابھارا جانا اور گردن گیر" ہونے کے ہیں اس آواز سے جو انسانی ضمیر، عام اصطلاحات کے ساتھ انجام دیتا ہے لیکن قرآن مجید سے اس کے برخلاف معنی نکلتے ہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ○ (سورہ شمس آیہ ۷-۸) ترجمہ: قسم ہے نفس کی اور جس نے اس کو بنایا، اس کے بعد اس کو الہام بخشا اور اس کے

دل میں پرہیزگاری اور گناہگاری کو ڈالا۔ اس آیت کی دلالت سے ہر انسان اپنے ضمیر اور خداداد سرشت کے ساتھ اپنے نیک و بد اور اچھے بُرے اعمال کو سمجھتا ہے اور اصلاحات کی آواز ہر انسان کے اندر چھپی ہوئی ہے لیکن بعض لوگ اس آواز کو سن کر نجات حاصل کر لیتے ہیں اور بعض دوسرے اس کی طرف توجہ نہ کرتے ہوئے اپنی بدنصیبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (شمس ۱۰)

ترجمہ: "وہ شخص نجات پا گیا جس نے اپنے نفس کی اچھی پرورش کی اور وہ شخص خسارے میں رہا جس نے اس کو اچھی پرورش سے روکا"۔ اور اگر نبوت اور رسالت بھی اسی صدائے ضمیر کا اثر ہوتا جو عام ہے تو سب افراد نبوت اور رسالت کو پہنچ جاتے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ منصب بعض افراد کے لئے مخصوص کر رکھا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: وَاِذَا جَآءَتْھُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (سورہ انعام آیہ ۱۲۴) ترجمہ: "جس وقت ان کے لئے ایک آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک وہ چیز جو خدا کے پیغمبروں کو دی گئی ہے، ہمیں بھی دی جائے خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے اور کس کے سپرد کرے"۔ یہ آیت اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ کفار ایمان لانے کے لئے شرطیں معین کرتے کہ رسالت کو عام ہونا چاہئے اور وہ بھی اس میں حصہ دار ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو منفی جواب دیا اور رسالت کے مخصوص ہونے کو محفوظ رکھا۔

۵۔ دوسری وضاحت کے متعلق

جیسا کہ پہلی توجیہہ کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے ابھی ہم اسلامی دعوت کی حقانیت اور پیغمبر اکرمؐ کے دعویٰ نبوت کو ثابت کرنے کی کوشش میں نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوسری توجیہہ بھی قرآنی آیات کے ساتھ مطابقت نہیں کرتی کیونکہ دوسری توجیہہ کے مطابق وہ اعتقادی اصول جن کی پیغمبروں نے لوگوں کو تلقین کی ہے، توہمی اعتقادات کا ایک سلسلہ ہے جو دینی سیاست کے ذریعے اس زمانے کے لوگوں پر جبری طور پر ٹھونسے گئے ہیں جو علم و دانش سے بے بہرہ تھے۔ البتہ یہ سب کچھ خیر خواہی کی وجہ سے تھے کیونکہ لوگ اس خدا کے ڈر سے جو دینی قوانین کی نافرمانی پر سخت سزا دیتا ہے اور روزِ قیامت کے خوف سے جس دن ان کے اعمال کی سزا دی جائے گی اور اسی طرح

فرماں برداروں کے لئے بہشت کی خوشخبری دی گئی ہے، اس کو حاصل کرنے کی خواہش جو صرف قیامت کے دن پر چھوڑ دی گئی ہے، دینی قوانین کی پیروی کریں۔

تمام پیغمبروں کی تاریخ زندگی زیادہ واضح نہیں ہے لیکن پیغمبر اکرمؐ کی تاریخ حیات بہت واضح ہے اور اگر کوئی شخص آنحضرتؐ کی سوانحعمری اور سیرت کا بغور مطالعہ کرے تو اس کے لئے کوئی شک باقی نہیں رہے گا کہ آنحضرتؐ اپنی دعوت پر سو فیصدی مکمل ایمان، اعتماد اور اطمینان رکھتے تھے، اس صورت میں اگر دینی اعتقادات کی داستان ایک توہمی داستان ہوتی تو اس قدر دلائل اور ثبوت جو قرآن مجید میں اسلامی اعتقادات کے بارے میں بیان کئے گئے ہیں، اور اسی طرح دنیا کے خالق، توحید اور خدا کی صفات اور نبوّت، معاد اور پیغمبری کے متعلق جو اعتقادات بیان ہوئے ہیں وہ بالکل بے معنی ہوتے۔

ح۔ خود قرآن مجید وحی اور نبوّت کے معنی کے بارے میں کیا فرماتا ہے؟

جیسا کہ قرآن مجید سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آسمانی کتاب (قرآن) پیغمبر اکرمؐ کو بھیجی جانے والی والی وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اور وحی ایک قسم کا آسمانی کلام (غیر مادی) ہے جس کو حس اور عقلی فکر کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک دوسرے عقل و شعور سے وابستہ ہے کہ کبھی کبھی بعض افراد میں خدائی ارادے کے مطابق پیدا ہو جاتے ہیں اور غیبی احکام (یعنی حس اور عقل کے بغیر) کو وحی اور خدائی تعلیم کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ اس امر کے حامل ہونے کو نبوّت بھی کہا جاتا ہے۔

۱۔ عام ہدایت اور انسانی ہدایت

اس مطلب کو واضح کرنے کے مندرجہ ذیل بیانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

اس کتاب کے اوائل میں ایک مفصل بحث کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں جو گوناگوں اقسام ظاہر ہیں کیا جاندار اور کیا بے جان، اپنی پیدائش اور فطرت میں ایک خاص مقصد اور ہدف کے حامل ہیں کہ اپنی پیدائش سے لے کر اس خاص ہدف اور مقصد کی طرف متوجہ اور رواں ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر اپنے

وجودی ڈھانچے میں قوتوں اور مختلف ہتھیاروں سے لیس ہیں جو اس چیز کی خاص فطرت اور خصوصیت مبداء اور منشا ہے۔ ایسی کارکردگیاں جو اس کو اپنے مقصد اور ہدف کے نزدیک اور آخر کار کامیاب بنا دیتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: رَبُّنَا الَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ○ (سورہ طٰہٰ آیہ ۵۰) ترجمہ: ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو خاص طور سے پیدا کیا اور پھر اس کو اس کے فائدے کی طرف رہنمائی کی۔ اور پھر فرماتا ہے: اَلَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ○ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی ○ (سورہ اعلیٰ ۲-۳)

ترجمہ: جس نے پیدا کیا، اس نے بنایا اور جس نے اندازہ دیا پس اس نے رہنمائی کی۔

اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بنی نوع انسان بھی اس مجموعی قاعدے اور عام ہدایت سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور اپنی زندگی میں ایک خاص مقصد رکھتے ہیں جس کی طرف زندگی بھر متوجہ ہیں۔ اس طرح ایسے ساز و سامان سے لیس ہیں جو ان کے مناسب ہے۔ لہٰذا ان کی کامیابی اپنے مقصد کو پاتے اور کمالِ سعادت تک پہنچنے میں ہی ہے۔ اور اس کی شکست اور ناامیدی اس مقصد کے حاصل نہ ہونے اور شقاوت و بدنصیبی ہدف تک نہ پہنچنے میں ہے لہٰذا انسان آفرینش اور فطرت کی رہنمائی کے ذریعے اپنے انتہائی مقصود کی طرف ہدایت حاصل کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ خصوصاً انسانی ہدایت کے بارے میں فرماتا ہے: اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ نَّبۡتَلِیۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِیۡعًا بَصِیۡرًا ○ اِنَّا هَدَیۡنٰهُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا ○

(سورہ دہر آیہ ۲-۳) ترجمہ: بلاشبہ ہم نے انسان کو ملے ہوئے نطفے (امشاج) سے پیدا کیا ہے جو ہمیشہ آزمائش کی صعوبتیں سہتا رہا ہے، اس کے بعد اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا، پھر اس کو راہِ ہدایت کی طرف رہنمائی کی خواہ وہ ناشکر ہو یا احسان مند۔

پھر فرماتا ہے: مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ○ ثُمَّ السَّبِیۡلَ یَسَّرَهٗ ○ (سورہ عبس آیہ ۲۰)

ترجمہ: انسان کو ایک نطفے سے پیدا کر کے اندازہ کیا یا اس کے لئے ایک اندازہ بنایا۔ اس کے بعد اس کے لئے راستہ آسان کر دیا اور راستے کو ہموار بنایا۔

۲۔ راہِ زندگی طے کرنے میں انسانی امتیازات

وہ فرق جو کائنات میں جاندار گروہ، بے جان گروہ سے رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ جانداروں کی فعّالیت، علمی فعّالیت ہے اور اپنے کاموں کو سوچ سمجھ کر عقل و شعور کے ذریعے انجام دیتے ہیں، انسان جو کہ تمام جانداروں کے ساتھ علمی فعّالیت میں شریک ہے، دوسرے جانداروں کی نسبت فرق رکھتا ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ انسان عقل و خرد اور شعور کا مالک ہے یعنی جن کاموں میں اس کے لئے فعّالیت کا امکان ہے، امکانِ فعّالیت کے باوجود ان کو انجام نہیں دیتا بلکہ خیر و شر اور نفع و نقصان کو پرکھتا ہے۔ اگر اس کام میں نفع زیادہ ہو تو اس کو انجام دیتا ہے اور اگر نقصان زیادہ ہو تو اس کام کو انجام دینے سے پرہیز کرتا ہے۔ اس طرح جو کام بھی انجام دیتا ہے اپنی تشخیص کے مطابق اور عقل و شعور کی پیروی میں کرتا ہے اور جس جگہ عقل نفع دیکھتی ہے اس کام کو انجام دینے کا حکم دیتی ہے اور جہاں صرف نقصان یا ضرر کو دیکھتی ہے اس کام کو ترک کرنے کا حکم صادر کرتی ہے (البتہ عقل کے حکم اور فیصلے سے مراد یہ ہے کہ کام کے ضروری ہونے یا ترک کرنے کو سمجھتی ہے لیکن کام کرنے کی دعوت دینا یا ترک کرنا ان دونوں صورتوں میں سے ایک، درحقیقت احساس سے تعلق رکھتا ہے کہ عقل احساس کے حکم کے مطابق اس عمل کو انجام دیتی ہے اور کام کے خالص نفع کو تصدیق یا تردید کرتی ہے۔ دراصل یہ سوچ سمجھ بناوٹی اور مصنوعی ہے چونکہ ہر کام میں سوچ سمجھ، فیصلہ اور حکم ایک ہی طرح کا ہے لہٰذا اس میں کافی غور کرنا چاہیئے)

۳۔ انسان کس لحاظ سے اجتماعی ہے؟

اس مطلب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بنی نوع انسان اپنے خارجی ماحول میں اجتماعی یا معاشرتی ہے اور ہمیشہ معاشرتی اور باہمی زندگی گزارتا رہا ہے اور گزارتا ہے۔ لہٰذا سب لوگ مل کر پورے تعاون سے اپنی ضرورتوں کو رفع کرتے ہیں، لیکن آیا اس تعاون اور مفاہمت کو اپنی حقیقی فطرت کے مطابق چاہتا ہے اور ہمیشہ سے یہی چاہتا رہا ہے کہ اپنے کاموں کو دوسروں کے ساتھ مل کر انجام دے اور مجموعی نتیجے سے اپنے اجتماعی وقار کے مطابق حصہ حاصل کرے؟ جس قدر ہمیں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ انسانی طبیعت

اور فطرت ضروریات رکھتی ہے اور اس کے علاوہ احساسات و عواطف کی بھی مالک ہے جو اپنی گوناگوں خواہشات کے ساتھ اپنی تمام قوتوں اور وسائل کو کام میں لاتی ہے، لہٰذا اس مرحلے میں دوسروں کی ضروریات اور خواہشات سے بے خبر ہے۔

انسان اپنی ضروریات کو پوری کرنے کے لئے سب چیزوں سے استفادہ کرتا ہے اور اپنے مقاصد کو پانے کی خاطر زمین کے مفردات اور مرکبات سے مدد حاصل کرتا ہے، گوناگوں درختوں کو، ان کے پتوں اور میووں سے لے کر شاخوں، تنوں اور جڑوں تک اور ایسے ہی ہر قسم کے حیوانات اور ان سے حاصل ہونے والی ہر چیز کو اپنی ضروریات کے لئے استعمال کرتا ہے، لہٰذا سب چیزوں کو کام میں لا کر ان کے فوائد سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی کمی کو حاصل شدہ چیزوں سے پورا کرتا ہے۔ وہ انسان جس کی حالت یہ ہے کہ جو چیز بھی پیدا کرتا ہے اس کو اپنے فوائد اور منافع کے لئے استعمال کرتے ہوئے اس کے نتائج سے استفادہ کرتا ہے۔ جب وہ اپنے ہم نوع (ہم جنس) لوگوں کے مقابل ہوگا تو کیا وہ ان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے ان کے فائدے کی خاطر اپنے منافع اور سود سے چشم پوشی کرے گا؟ ہرگز ہرگز نہیں۔

بلکہ ایک طرف تو انسان اپنی بے اندازہ ضروریات، جن کو پورا کرنے میں ہرگز اکیلا کامیاب نہیں ہو سکے گا احساس کرتا ہے اور ان تمام ضروریات کو پورا کرنے کے امکانات اپنے ہم جنس افراد کے ہاتھ میں خیال کرتا ہے اور دیکھتا ہے، کیونکہ وہ امیدیں، آرزوئیں، خواہشات وغیرہ جو اس کے اندر چھپی ہوئی ہیں دوسرے لوگوں میں بھی موجود ہیں جو اس کی طرح کے انسان ہیں اور چونکہ انسان اپنے منافع کا دفاع کرتا ہے اور اس کو چھوڑنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتا لہٰذا دوسرے انسانوں کا بھی یہی حال ہے۔

اسی لئے انسان مجبوراً اجتماعی اور معاشرتی تعاون پر آمادہ ہوتا ہے اور اپنے کام کے منافع سے تھوڑا سا حصہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسروں سے منافع حاصل کرتا ہے۔ درحقیقت وہ لین دین کے عام بازار میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح یہ بازار ہمیشہ جاری ہے اور ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی اس میں بکتی ہیں۔

اور آخر کار معاشرے کے نتیجۂ کار کا ایک ڈھیر لگ جاتا ہے اور تمام افراد اپنے اجتماعی اور معاشرتی وقار

اور وزن کے مطابق جتنا کام کرتے ہیں اس مذکورہ محصول سے حصہ اٹھا لیتے ہیں اور اس حاصل شدہ حصے سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرتے ہیں۔

گزشتہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انسان جو اپنی فطری ضروریات کے مطابق اپنا ہی نفع چاہتا ہے، یہ ہے کہ دوسروں کو اپنے نفع کی خاطر نوکر رکھے، اور ان کے کام کے حاصلہ نتائج سے فائدہ اٹھائے۔ لہٰذا صرف مجبوری کے باعث وہ معاشرتی تعاون پر راضی ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بچوں کے حالات کا مطالعہ کرنے سے زیادہ تر واضح ہو جاتا ہے کیونکہ جس قدر بچے کا دل چاہے بغیر کسی چون چرا کے مانگ لیتا ہے بلکہ زیادہ کے لئے بھی درخواست کرتا کرتا ہے اور اپنی خواہش کو روتے کے ساتھ تاکید کرتا ہے اور جب آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہے اور اجتماعی حالات سے زیادہ واقف ہو جاتا ہے تو بتدریج اپنی خواہشات سے چشم پوشی کر لیتا ہے یہاں تک کہ مکمل طور پر معاشرے میں داخل ہو کر بیہودہ گوئی کو بالکل بھول جاتا ہے۔

اس مطلب کی دوسری شہادت یہ ہے کہ عملی طور پر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب انسان دوسروں سے زیادہ طاقت حاصل کر لیتا ہے تو بے تامل معاشرتی تعاون اور اس کی ضرورت سے چشم پوشی کرتے ہوئے دوسرے افراد کو نوکر رکھ لیتا ہے اور ان کے منافع کار کو بغیر معاوضے کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس معاشرتی تعاون کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (سورہ زخرف آیہ ۳۲) ترجمہ: ہم نے زندگی میں ان کے لئے سرمایۂ زندگی، ان کے درمیان تقسیم کر دیا ہے اور ان میں بعض لوگوں کو بعض پر برتری اور فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے بعض دوسروں کو مسخر کر لیں۔

آیۂ کریمہ انسانی معاشرتی تعاون کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس میں بعض افراد بعض دوسرے افراد پر سرمایۂ زندگی میں فائق اور برتر ہیں جس کے نتیجے میں افراد اپنے مختلف درجات کے لحاظ سے متفاوت ہیں اور ان میں سے جو کوئی فائق اور برتر ہے دوسروں کو مسخر کر کے ان اعمال کو اپنے نفع کی طرف لوٹا دیتا ہے اس کے نتیجے میں معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ تار و پود کی طرح آپس میں بُنے ہوئے ہیں اور اس

طرح ایک واحد معاشرے کو بناتے ہیں۔

اور پھر فرماتا ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ (سورۂ ابراہیم آیہ ۳۴) ترجمہ: بیشک انسان ستمگار اور ظالم ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (سورہ احزاب آیہ ۷۲) ترجمہ: کیونکہ وہ ستمگار اور ظالم تھا یہ آیات کریمہ اشارہ کرتی ہیں کہ انسان اپنی فطری خواہش کے مطابق دوسروں کے حقوق کو پامال کرتے ہوئے ان کے منافعوں پر قبضہ کرلیتا ہے۔

۴۔ اختلافات کا پیدا ہونا اور قانون کی ضرورت

اگرچہ انسان نے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مڈبھیڑ کے لحاظ سے مجبوراً معاشرتی تعاون کو قبول کرلیا ہے اور اس طرح دراصل اپنی آزادیٔ عمل کا کچھ حصہ بعض دوسروں کی حفاظت کے لئے نثار کردیا ہے لیکن اس معاشرتی تعاون کی بنیاد افراد کے درمیان موجود جسمانی اور روحانی طاقت میں فاحش اختلافات اور بے اعتدالی کی وجہ سے اس درد کا علاج نہیں ہوسکتا اور افراد کے منافعوں کی مڈبھیڑ اور کشمکش کی وجہ سے جو سوسائٹی اور معاشرہ اختلافات کو حل اور ختم کرنے کے واسطے پیدا ہوا تھا وہی سب سے پہلے فساد اور اختلافات کا باعث بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشترک قوانین اور اصول جو معاشرے کے تمام افراد کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ احترام ہوں، ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر حتیٰ کہ معمولی لین دین کے لئے خریدار اور بیچنے والے کے پیش نظر مشترک قوانین نہ ہوں جو دونوں کے لئے قابلِ احترام ہوں تو سودا نہ ہوگا پس افراد کے درمیان قوانین بننے چاہئیں تاکہ ان کے جاری اور نافذ ہونے سے معاشرہ خراب ہونے اور افراد کے منافع ضائع ہونے سے محفوظ رہیں اور فطری تنظیم جس کا مقصد انسان کی ہدایت اور سعادت ہے انسان کو اس قانون کی جانب ہدایت کرے جس میں معاشرے کی سعادت کی ضمانت ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۝ (سورہ عبس آیہ ۱۹-۲۰) ترجمہ: "انسان کو ایک نطفے سے پیدا کرکے اندازہ کیا یا اس کے لئے ایک اندازہ بنایا اس کے بعد اس کے لئے راستہ آسان کردیا اور راستے کو ہموار بنایا"۔ انسان کے لئے راہِ زندگی کو آسان بنانے کا

مقصد یہ ہے کہ معاشرتی زندگی اس کے لئے مقدور ہو اور قوانین و اصول اس کی دسترس میں ہوں۔

۵۔ قانون کی طرف انسان کو ہدایت و رہنمائی کرنے کیلئے عقل کافی نہیں ہے

یہ ہدایت ہر وسیلے سے اور ہر کسی کی طرف سے ہو فطری تنظیم کا ہی کام ہوگا کیونکہ صرف وہی تنظیم ہے جس نے انسان کو پیدا اور خلق کیا ہے اور اس کے سامنے سعادت کا مقصد رکھا ہے۔ اس تنظیم کا پروگرام عمومی ہدایت ہے جس میں انسانی ہدایت کا پروگرام بھی شامل ہے۔

واضح ہے کہ فطرت کے کاموں میں کسی قسم کی خطا اور تناقض ہرگز موجود نہیں ہے۔ اگر کبھی ایک سبب اپنے مقصد سے دور رہتا ہے یا منحرف ہو جاتا ہے تو یہ اس سبب کا گناہ نہیں ہے بلکہ اس سبب کی تاثیر کی وجہ ہے یا بعض دوسری وجوہات ہیں کہ اس سبب کی تاثیر کو ختم یا منحرف کر دیتی ہے اور اگر اسباب کی مزاحمت نہ ہو تو ہرگز ایک سبب دو متضاد اور متناقض کام انجام نہ دیتے اور نہ ہی اپنے کام میں خطا یا انحراف کو قبول کرتے۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ اس قانون کی طرف ہدایت اور رہنمائی جو تمام اختلافات کو حل کر سکے عقل کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ یہی عقل ہے جو انسان میں دوسروں کو غلام بنانے اور مکمل طور پر اپنے منافع کی حفاظت کرنے کے لئے آزادیٔ عمل کو پیدا کرتی ہے اور ایک معتدل معاشرے کو مجبوراً قبول کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ فطرت میں ایک ایسی طاقت جو دو مختلف اعمال اور افتراق یعنی اختلافات کو پیدا کرنے اور پھر ان اختلافات کو حل کرنے والی ہو ممنشا بدہ نہیں ہو سکتی۔

اس قدر بے شمار خلاف ورزیاں اور قانون شکنیاں جو موجودہ قوانین کے بارے میں ہر روز ظاہر ہوتی ہیں اور ان کو گناہ شمار کیا جاتا ہے، یہ سب ان لوگوں سے سرزد ہوتی ہیں جو عقل و خرد کے مالک ہیں ورنہ ان کو گناہ نہ کہا جاتا، اور اگر عقل، اختلافات کو حل کرنے والے قوانین کی طرف ہدایت کرتی تو فطری طور پر خلاف ورزی کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتی تھی اور خلاف ورزیوں پر راضی نہ ہوتی بلکہ ان کی ممانعت کرتی۔

عقل کے باوجود ان تمام خلاف ورزیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ عقل کی طرف سے ایک معتدل معاشرے کو قبول کرنا اور ان قوانین پر چلنا جو اجتماعی عدالت کی ضمانت دیتے ہوں مجبوری اور لاچاری کی حالت میں تھا جو مکمل آزادی کی مانع تھی ورنہ اس کے برعکس یہ وجودِ مزاحم، تعاون اور معاشرتی عدالت کے قانون کا حکم نہ دیتی۔

قانون کی خلاف ورزی کرنے والے یا تو وہ اشخاص ہیں کہ جو قوۂ مجریہ سے زیادہ طاقت رکھتے ہوں، اور بے دھڑک خلاف ورزی کرتے ہیں اور یا وہ اشخاص ہیں جو دوری (فاصلے) اپنی پناہ گاہوں کی مضبوطی یا محافظوں کی غفلت کی وجہ سے قانون نافذ کرنے والوں کی دسترس سے باہر ہیں یا اپنے لئے انہوں نے بہانے بنا رکھے ہیں کہ اپنی خلاف ورزی کو قانونی جلوہ دیں، مظلوموں کی بیچارگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں بہر حال ان لوگوں کے سامنے کسی قسم کی مزاحمت اور ممانعت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو وہ بے اثر اور بہت کم ہوگی، لہٰذا واضح ہے کہ عقل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتی اور ان کی مکمل آزادی کی ممانعت نہیں کرتی بلکہ دوسروں کو غلام اور نوکر بنانے کی خواہش کو انہی پر چھوڑ دیتی ہے۔

پس عقل اس اجتماعی یا معاشرتی قانون کی طرف ہدایت نہیں کر سکتی جو معاشرے کے منافع کو پورا کرے اور اس کی ضمانت دے اور اسی طرح وہ منافع انفرادی اور عادلانہ طور پر انسان کی حفاظت کرے کیونکہ صرف اس صورت میں معتدل معاشرے میں قانون کے لحاظ کا فیصلہ دیتی ہے کہ اس کے لئے کوئی زحمت موجود نہ ہو لیکن جہاں بھی اپنے مقابلے میں مطلق آزادی کی رکاوٹ کا احساس نہ کرے اس وقت ہرگز ایسا حکم نہیں دیتی یا اس کے برخلاف حکم دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (سورہ علق آیہ ۷)

ترجمہ: "بیشک جونہی انسان اپنے آپ کو بے نیاز اور مستغنی دیکھتا ہے تو اپنی حدود سے تجاوز اور تعدی کرے گا۔"

اور ان بے نیازیوں میں سے تعاون اور قانون ہے اور وہ بھی اپنے منافع کی حفاظت کے لئے۔

۶ — انسانی ہدایت کا واحد راستہ وحی کا راستہ ہے

گزشتہ بحثوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان، تمام کائنات کی طرح اپنی زندگی میں سعادت کا مقصد پیش نظر رکھتا ہے اور چونکہ وجودی ساخت اور فطری ضروریات کے لحاظ سے معاشرتی زندگی گزارنے پر مجبور ہے لہٰذا اس کی سعادت اور خوش بختی معاشرے کی سعادت اور خوش بختی میں ہی ہے۔ بہر حال وہ ایک متفقہ معاشرے کا جزء ہے اور اپنی انفرادی فطرت کی بہتری معاشرے میں تلاش کرتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ صرف ایک مشترک قانون ہی براہِ راست معاشرے کی سعادت اور ایسے ہی انفرادی سعادت کی عادلانہ طور پر ضمانت دیتا ہے۔

اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو بھی دوسری ساری کائنات کی طرح سعادت اور سعادت کے دوسرے لوازمات کو جو اس دیباچے میں آئے ہیں آفرینش (فطرت) سے ہدایت حاصل کرنی چاہئے اور انسانی سعادت اس کی معاشرتی سعادت سے وابستہ ہے جس کے نتیجہ میں فطرت کے ذریعے مذکورہ مشترک قانون کی طرف اس کی راہنمائی ہو، پھر اس کے بعد ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانی عقل قانون کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ تمام حالات میں عقل، عام تعاون اور معاشرتی عدالت کا لحاظ کرنے کا حکم نہیں دیتی۔

مندرجہ بالا مقدمات سے یہ نتیجہ حاصل کرنا چاہئے کہ بنی نوع انسان کے درمیان عقلی ادراک کے علاوہ ایک اور ادراک موجود ہونی چاہئے کہ کائنات کی راہنمائی اور ہدایت اس کے ذریعے انجام پذیر ہو، لہٰذا ان کو اُف کے ساتھ ایک ایسا راستہ جو عقل کے راستے کے علاوہ بنی نوع انسان میں موجود ہے، ادراک کا ایسا راستہ ہے جس کے بارے میں انسانوں میں سے بعض افراد جن کو پیغمبر اور خدا کے رسول کہا جاتا ہے، اس کے متعلق بتاتے آئے ہیں اور اس کو "آسمانی وحی" کہتے ہیں اور اسی پر ہی اپنی دعوت اور دعویٰ پیغمبری کی بنیاد رکھی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط (سورہ بقرہ آیہ ۲۱۳) ترجمہ (خلاصہ) تمام انسان ایک ہی امت تھے، وہ بڑی سادگی کے ساتھ اختلافات کے بغیر زندگی گزارتے تھے، اس کے بعد اختلافات رونما ہوئے۔ پس خدا نے پیغمبروں کو بھیجا جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب حق شریعت نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ کرے۔

پھر فرماتا ہے: اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (یہاں تک کہ فرماتا ہے) رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ط (سورۃ النساء ۱۶۳-۱۶۵) ترجمہ: ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جیسا کہ حضرت نوحؑ پر بھیجی اور حضرت نوحؑ کے بعد دوسرے پیغمبروں پر بھی بھیجی۔ (یہاں تک کہ فرماتا ہے) پیغمبر اور رسول جو خوشخبری دینے والے

اور ڈرانے والے تھے اسلئے کہ لوگوں کو خدا پر کوئی شک نہ رہے بلکہ لوگوں پر خدا کی حجت مکمل ہو جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ پہلی آیت میں وحی اور نبوت لوگوں کے درمیان اختلاف رفع کرنے کا واحد راستہ بتایا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عقل راستہ دکھانے کے لئے کافی نہیں ہے یعنی اگر پیغمبر اور رسول نہ بھیجے جاتے اور احکام خداوندی کی تبلیغ نہ ہوتی تو لوگ ظلم اور فساد کرتے رہتے۔ اگر صرف وہ عقل کے مالک ہوتے اور ظلم و فساد کی برائی کو جانتے تو خدا کے سامنے ان کی پوچھ گچھ نہ ہوتی۔

۷ ــــ مشکلات اور جوابات

مشکل: آپ نے اس بہانے سے کہ عقل، قانون کی خلاف ورزی کو روکنے سے قاصر ہے، قانون سازی کا فرض یا کتاب (قرآن) کی تعبیر کے مطابق انسان کو سعادت کی طرف رہنمائی کرنے کی ذمہ داری کو عقل سے چھین کر وحی اور نبوت کے سپرد کر دیا ہے، حالانکہ وحی کی طرف سے نافذ شدہ قوانین و اصول بھی یہ کام نہیں کر سکتے، اور خلاف ورزیوں کو روکنے سے عاجز ہیں بلکہ شریعتوں اور مذاہب کے قوانین کی خلاف ورزی زیادہ ہے اور لوگ ان قوانین کو کمتر قبول کرتے ہیں۔

جواب: راستہ دکھانا اور راہنمائی کرنا ایک ہی مطلب ہے، جو چیز عام راہنمائی کے قانون کے مطابق فطرت اور آفرینش کے ذمے ہے وہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو مختلف طریقوں سے اس قانون کی طرف ہدایت کرے جس میں اس کی سعادت کی ضمانت دی گئی ہو، نہ یہ کہ عملی طور پر خلاف ورزی کے راستے مسدود کر کے افراد کو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کرے۔

اور یہ امر کہ ہم نے قانونی خلاف ورزی کو جو آزادیٔ عمل کی مانع اور مزاحم ہے اس کو عقل کے ناکافی ہونے کی دلیل سمجھ لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عقل عمل کی ممانعت نہیں کرتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل نے اس مسئلے کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا اور قانون کی پیروی اور معاشرتی تعاون کی طرف دعوت نہیں کی کیونکہ اس کی دعوت مجبوری پر مبنی تھی اور اس مخالفت اور مزاحمت کو جو آزادیٔ عمل کی مانع ہے، اپنے مقابل میں احساس کرتی تھی۔ اس طرح آزادیٔ عمل کے نقصان کو اس کے نفع سے زیادہ تشخیص دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسا حاکم،

جس جگہ آزادیِ عمل کے لئے کسی قسم کی ممانعت اور مزاحمت موجود نہ ہو جس آزادئ عمل میں خلاف ورزی کی ممانعت ہو اور اس قانون کی پیروی جو آزادی کے خلاف ہو، اس کا حکم نہیں دے گی۔

پس چونکہ عقل ہر جگہ قانون کی پیروی اور اطاعت کرنے کا حکم نہیں دیتی لہٰذا ہمیشہ کے لئے انسانی ہدایت اور راہنمائی کے لئے کافی نہیں ہے لیکن "وحی" کا طریقہ بغیر کسی استثناء کے کلی طور پر ہمیشہ قانون کی پیروی اور اطاعت کا حکم دیتا ہے اور اس حکم کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے جو اپنی طاقت اور لامتناہی علم کے ذریعے، ہر حال میں انسان کا حافظ اور نگہبان ہے اور بغیر کسی فرق کے نیک کاموں کا اچھا صلہ اور برے کاموں کا برا بدلہ دے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (سورہ یوسف آیہ ۴۰) حکم صرف خدا کا حکم ہے۔ (حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری) اور فرماتا ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (سورہ زلزال آیہ ۸) ترجمہ: پس جس کسی نے ذرہ برابر نیک کام انجام دیا (خدا) اس کا نیک صلہ دے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی (خدا) اس کی سزا دے گا۔

اور پھر فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (سورہ حج آیہ ۱۷) ترجمہ: بیشک قیامت کے دن خداوند تعالیٰ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا کیونکہ خدا تم ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ پھر فرماتا ہے: اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○ (سورہ بقرہ آیہ ۷۷) ترجمہ: آیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ جو کچھ وہ مخفی کرتے ہیں اور یا جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں خدا ان سب کو جانتا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے: وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ○ (سورہ احزاب آیہ ۵۲) ترجمہ: خدا ہر چیز پر ناظر ہے۔

یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ آسمانی دین جو وحی کے ذریعہ نازل ہوا ہے خلاف ورزی کو روکنے اور قانون شکنی کا ازالہ کرنے میں معمولی انسانی قوانین سے مضبوط ہے کیونکہ خلاف ورزیوں اور قانون شکنیوں کو روکنے کے لئے انسانی قوانین کا وسیلہ یہ ہے کہ لوگوں کے اعمال و کردار پر محافظوں اور مبصروں کو متعین کیا جائے اور خلاف ورزی اور قانون شکنی کرنے والوں کے لئے سزائیں معین کریں جو صرف قانونی طاقت اور جرم کے عملی ہونے کے بعد ہی جاری

ہو سکتی ہیں اور بس۔

لیکن آسمانی دین سب سے پہلے تو انسانی قوانین اور حکومتوں کی طرح خاص مبصر اور محافظ و نگہبان نہیں رکھتا جو ان کے ظاہری اعمال کو دیکھتے ہیں۔ دوسرے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض قائم کرکے بغیر کسی استثنیٰ کے تمام انسانوں کو ایک دوسرے کے اعمال و کردار اور قانون کا نگہبان اور محافظ بنایا ہے۔ تیسرے، عقائد دینی میں شامل ہے کہ انسانوں کے اعمال لکھے جاتے ہیں اور روز قیامت میں باز پرس کے لئے محفوظ اور قائم ہو جاتے ہیں۔ چوتھے اور ان سب سے بڑھ کر خداوند تعالیٰ جو تمام کائنات کا خدا ہے، انسانوں کے اعمال اور ماحول پر ہر جگہ اور ہر وقت حاضر و ناظر ہے۔

اس طرح اعمال کی سزا کے بارے میں اس دنیا میں سزا کے علاوہ جو انسانی قوانین کی طرح ہر جرم میں معین ہوتی ہے، قیامت کے دن بھی بغیر کسی استثناء کے سزا کا دیا جانا، دینی عقائد میں شامل ہے۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (سورہ نسا ۵۹)

ترجمہ: خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کرو، پیغمبر اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔ پھر فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورہ توبہ آیہ ۷۱) ترجمہ: بعض با ایمان آدمی اور عورتیں بعض دوسروں کے سرپرست ہیں جو امر معروف اور نہی منکر کرتے ہیں۔ اور فرماتا ہے: وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ○ (سورہ انفطار ۱۰-۱۲) ترجمہ: بیشک تم پر نگہبان اور محافظ رکھے گئے ہیں جو خدا کے سامنے بہت عزیز ہیں اور تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔ اور پھر فرماتا ہے: وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (سورہ سبا آیہ ۲۱) ترجمہ: اور تیرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے۔

دوسری مشکل: گزشتہ بیانات کے مطابق عقل تمام حالات میں قانون پر چلنے اور خلاف ورزی سے اجتناب کرنے کا حکم نہیں دیتی اور یہ مطلب آئمہ اہلبیتؑ کی بعض احادیث کے منافی ہے جن کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر دو دلیلیں رکھتا ہے یعنی حجّتِ ظاہری جو پیغمبر ہیں اور حجّتِ باطنی جو انسان کی عقل ہے کیونکہ گزشتہ بیان کے مطابق عقل تمام امور یا اکثر خلاف ورزیوں کے بارے میں حکم نہیں دیتی تاکہ حجّت رکھے۔

جواب: انسان کی عملی عقل کا کام، جو استثنیٰ کو قبول نہیں کرتی، نفع کی طرف توجہ اور نقصان سے پرہیز کرنے کی طرف دعوت دیتی ہے اور اگر منافع پرست اور دوسروں سے کام لینے والے انسان (جیسا کہ گزشتہ بیان میں آیا ہے) کا تعاون مجبوری کی خاطر ہو اور مجبوری کا مطلب انہی لوگوں کی طاقت پر منحصر ہو جو دوسروں کے اعمال سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں تو اس صورت میں اگر مجبور کرنے والے مسائل موجود نہ ہوں تو عقل ہرگز قانون کی اطاعت اور پیروی کرنے کا حکم صادر نہیں کرے گی اور اسی طرح خلاف ورزی اور قانون شکنی کی مخالفت بھی نہیں کرے گی۔

لیکن اگر مجبوری کا منشاء (جیسا کہ نظریۂ وحی میں بیان کیا گیا ہے) حکم خدا اور انسانوں کے اعمال پر نگہبانی، خلاف ورزی کا بدلہ، نیکیوں اور بدیوں کے بارے میں استثنیٰ وغیرہ خداوند تعالیٰ کے ذمے ہو جو غفلت، جہل اور کمزوری سے پاک ہے تو اس مسئلے میں عقل کو ہرگز دخل نہیں ہوگا تاکہ ضرورت کے پیش نظر حکم کو قبول نہ کرے اور ہمیشہ کے لئے جس چیز کا وحی حکم دیتی ہو عقل بھی اس کے بارے میں حکم کرے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (سورہ رعد ۳۳)

ترجمہ: آیا جو شخص نفس (انسان) اور کام پر پا رجا ہے وہ دوسروں کی طرح ہے؟ اور فرماتا ہے: اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ (سورہ طارق آیہ ۴) خلاصہ ترجمہ: کوئی نفس (شخص) بے نگہبان نہیں ہے، اور پھر فرماتا ہے: كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ (سورہ مدثر آیہ ۳۸)

ترجمہ: ہر نفس (شخص) اپنے کام کا رہین ہے۔

۸۔ وحی کا طریقہ ہر قسم کی غلطی اور خطا سے مبرا ہے

گزشتہ بیان کے مطابق وحی کا طریقہ اور انسان کی معاشرتی زندگی کے پروگرام کی تعلیم آفرینش اور فطرت کے پروگرام میں شامل ہے۔ یہ بھی واضح ہو گیا کہ فطرت اور قدرت ہرگز اپنے کام میں خطا نہیں کرتی پس آسمانی دین کا سبق جو وحی کے ذریعے انسانوں کو سکھایا جاتا ہے پوری زندگی میں ہرگز خطا یا اشتباہ سے دوچار نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى

مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ○

(سورہ جن آیہ ۲۶-۲۸) خلاصہ ترجمہ: وہ (خدا) ہی صرف علم غیب جانتا ہے پس کسی کو بھی اپنے غیب پر حاوی نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبروں میں سے پسند کرے۔ اور اس صورت میں ہر طرف سے اس کا محافظ رہتا ہے تاکہ مکمل طور پر خداوند تعالیٰ کے پیغام انسانوں تک پہنچائیں۔ خدا تمام انسانوں کے رازوں اور دلوں کی باتوں کو جانتا ہے، اور ہر چیز کے عدد کو جانتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں اور رسولوں کو معصوم (بے گناہ، بے خطا) ہونا چاہیئے۔ یعنی عالم بالا سے وحی حاصل کرنے اور اس کی حفاظت میں بھی اور ایسے ہی جو تعلیم خدا سے حاصل کی ہے اس کی تبلیغ میں بھی ہر قسم کی خطا اور گناہ سے محفوظ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ عام ہدایت اور راہنمائی کے لئے فطری تنظیم میں وسیلۂ کار ہیں اور اگر وحی کو یاد کرنے، حفاظت کرنے اور پہنچانے میں کسی قسم کی غلطی یا خطا کریں یا شیطانی وسوسوں اور نفسانی خواہشات کے ذریعہ ان سے خیانت یا گناہ سرزد ہو تو مجبوراً جس چیز کا انہوں نے "زبانی تبلیغ" کا وعدہ کیا ہے، اس کے خلاف "عملی تبلیغ" ہوگی اور فطری تنظیم کی تمام صورتوں میں ہدایت اور رہنمائی کے سلسلے میں جو بھی عمل انہوں نے انجام دیا ہو وہ سراپا غلط ہوگا اور ان کا ہر عمل بے حقیقت واقع ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (سورہ نحل آیہ ۹)

خلاصہ ترجمہ: یہ خدا کے ذمہ ہے کہ معتدل اور آسان راستہ لوگوں کے سامنے رکھے اور ایک دوسرا راستہ بھی ہے کہ جس میں کجروی، خود غرضی اور ظلم ہے۔

۹ — ہمارے لئے وحی کی حقیقت مجہول اور نامفہوم ہے۔

جو موضوع گزشتہ بحثوں سے واضح ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا پروگرام جو ایک قسم کی سعادت حاصل کرنے کا پیش خیمہ ہے اور اس کی تعلیم فطرت کے ذمے ہے، ممکن ہی نہیں کہ عقل کے ذریعے اس کو حاصل ہو بلکہ عقل کے علاوہ ایک اور قوتِ ادراک ہونی چاہیئے کہ انسان جس کے ذریعے زندگی کے بعض فرائض پر غور کر سکے۔

ہم اس طریقے کو وحی کا طریقہ کہتے ہیں۔

البتہ دلیل اور برہان کا تقاضا اسی قدر ہے کہ بنی نوع انسان میں ایسی قوتِ ادراک کا موجود ہونا ضروری نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ قوت عام ہو بلکہ چونکہ وحی کو سمجھنے کیلئے ایک پاک ادراک کی ضرورت ہے جو ہر قسم کی آلودگی اور پلیدی سے پاک ہو اور انسان، استقامتِ حال، اعتدالِ ادراک اور صفائے روح اور ایسے ہی ان کے برخلاف صفات میں بالکل مختلف ہیں، لہٰذا یہ کہنا چاہیئے کہ خدا کی یہ بخشش (موہبت اور عنایت) صرف بعض بندوں میں ندرت سے موجود ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید ایک ایسے گروہ کو پیغمبروں اور رسولوں کے نام سے یاد کرتا ہے لیکن ان سب کے نام لینے اور تعداد شمار کرنے سے پرہیز کرتا ہے، اس جماعت سے صرف چند ایک کے نام لیتا ہے۔[1]

ہم جو کہ اس خدائی عنایت اور موہبت سے بے بہرہ ہیں اور دوسرے الفاظ میں اس موہبت کا مزہ نہیں چکھا ہے اس کی حقیقت ہمارے لئے مجہول ہے۔ صرف اس کے بعض آثار جیسے قرآن مجید ہے اور اس کے بعض اوصاف جو نبوت کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں یا ہم نے انہیں سنا ہے، موجود ہیں اور یہ ممکن ہے ایسے ہی دوسرے اوصاف و خواص بھی موجود ہوں جن کی تشریح اور وضاحت ہمارے لئے نہیں کی گئی ہے۔

۱۰ — وحیِ قرآن کی کیفیّت

مختصر طور پر جیسا کہ قرآن مجید وحی کی کیفیت میں خود وضاحت کرتا ہے، یہ ہے کہ اس آسمانی کتاب کی وحی تکلّم یا گفتگو کے طور پر تھی اور خداوند تعالیٰ نے اپنے پیغمبر گرامیؐ سے کلام کیا ہے اور آنحضرتؐ نے پوری تن دہی

---

[1] آدمؑ، نوحؑ، ادریسؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ، اسمٰعیلؑ، الیسعؑ، ذوالکفلؑ، الیاسؑ، یونسؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، شعیبؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، اسمٰعیل صادق الوعدؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ۔ یہ وہ پیغمبر ہیں کہ جن کا ذکر ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے بعض کا ذکر اشارۃً آیا ہے جیسا کہ "اسباط" (سورہ نساء آیہ ۱۶۳) اور اسی طرح وہ پیغمبر جس کی دعا سے طالوت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا (سورہ بقرہ آیہ ۲۴۶) ایسے ہی وہ پیغمبر جن کا ذکر سورہ بقرہ آیہ ۲۵۸ میں آیا ہے اور اسی طرح دوسرے بعض پیغمبران جن کی طرف سورہ یٰس آیہ ۱۴ میں اشارہ ہوا ہے۔

سے (نہ صرف کانوں سے) خدا کے کلام کو سنا اور سمجھا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ○ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (سورہ شوریٰ ۵۱-۵۲) ترجمہ: کوئی شخص خدا سے کلام نہیں کرسکتا مگر یہ کہ اس کی طرف وحی بھیجے یعنی پنہاں طور پر یا اشارے کے ساتھ اس سے بات کرے جس کو دوسرے نہ سمجھ سکیں یا درپردہ گفتگو کرے یا رسول اور پیغمبر بھیجے اور وہ خدا کے حکم سے جیسا کہ خدا چاہے اس پر وحی نازل کرے کیونکہ خدا بلند مرتبہ اور پختہ کار ہے اور ہم نے اپنے حکم سے وحی کو یعنی قرآن مجید کو تم پر نازل کیا ہے، تو خود اس کو نہیں سمجھتا تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کیا شے ہے؟ لیکن ہم نے اس کو نور بنا کر بھیجا تاکہ جن لوگوں کو ہم چاہتے ہیں اس نور کے ساتھ ان کی راہنمائی کرتے ہیں اور بیشک تو ان کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

وہ شک وشبہ اور تردید جو پہلی آیہ کریمہ میں موجود ہے اور وحی جو پہلی قسم میں ظاہری طور پر بیان نہیں کی گئی اور تیسری قسم میں رسول سے منسوب کی گئی ہے اس آیہ شریفہ میں خدا کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے تین مختلف قسموں میں اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱ خدا کا کلام جو براہِ راست ہو اور خدا اور انسان کے درمیان کوئی وسیلہ یا ذریعہ نہ ہو۔

۲ خدائی گفتگو جو درپردہ کی جائے جیسا کہ "شجرِ طور" کہ موسیٰؑ خدا کے کلام کو اس (درخت) سے سنا کرتے تھے۔

۳ خدائی کلام جس کو ایک فرشتہ ایک انسان کی طرف لائے۔ اس صورت میں فرشتے کا کلام وحی کے طور پر سنا اور کہا جائے گا جو خدا کے حکم اور کلام کی حکایت کرتا ہے۔

اور دوسری آیہ کریمہ کہ قرآن مجید اسی ذریعے سے پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوا ہے اور یہاں اس کا مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کی وحی، کلام اور گفتگو کے ذریعے ہوئی اور پھر فرماتا ہے: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○

(سورہ شعراء آیہ ۱۹۳-۱۹۵) ترجمہ: قرآن مجید کو روح الامین یعنی جبریل نے تمہارے دل پر یعنی تم پر عربی زبان میں آشکارا نازل کیا تاکہ تو ان لوگوں میں ہو جو لوگوں کو خدا سے ڈراتے ہیں۔ اور فرماتا ہے: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ (سورہ بقرہ آیہ ۹۷) ترجمہ: اے پیغمبرؐ کہہ دو کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہے، وہی جبریل قرآن مجید کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کرتا ہے نہ کہ بغیر (خدا کے) حکم سے یا اپنی طرف سے۔

ان آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ قرآن مجید یا قرآن کا ایک حصہ فرشتۂ وحی جس کو روح الامین بھی کہا جاتا ہے، کے ذریعے بھیجا گیا ہے (کہ گفتگو کی تیسری قسم ہے) لہٰذا پیغمبر اکرمؐ قرآن مجید کو فرشتۂ وحی سے اپنے نفس یعنی تمام جان و دل کے ساتھ منسوب کرتے تھے نہ کہ صرف کانوں (سننے) کے ذریعے سے۔

پھر فرماتا ہے: فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ○ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ○ (سورہ نجم آیہ ۱۰-۱۲) ترجمہ: پس (اللہ نے) اپنے بندے پر وحی بھیجی اور جس چیز کے متعلق وحی نازل کی وہ غلط یا جھوٹ نہیں۔ قلب یعنی نفس[1] پیغمبر اکرمؐ نے جس چیز کا مشاہدہ کیا آیا تم اس کے ساتھ اسی چیز کے بارے میں مخالفت یا جنگ کرتے ہو جس چیز کو پیغمبرؐ نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔

اور دوسری جگہ وحی کے معنی کو تعبیر کی تختیاں پڑھنے سے منسوب کیا ہے: رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ○ (سورہ بیّنہ آیہ ۲) ترجمہ: خدا کی جانب سے رسول بھیجا گیا ہے جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے۔

اس بحث کے آخر میں یہ بھی عرض کر دیتے ہیں کہ وحی کے بارے میں قرآن مجید سے بہت سی صفات و خواص اور توضیحات و مسائل نکلتے ہیں کہ یہ اس کتاب میں ان سب مطالب اور مسائل کی گنجائش نہیں ہے اور مختصر طور پر ان میں سے چیدہ چیدہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

---

[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں آیتوں میں قرآن مجید کے نزول کو پیغمبر اکرمؐ کے دل و جان سے منسوب کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے علیٰ قلبک اور علیک نہیں فرمایا۔ قلب کا مطلب قرآنی آیات میں نفس ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں چند جگہ ادراک (عقل) و شعور اور اسی طرح گناہ کو نفس سے تعلق رکھتے ہیں، قلب (دل) سے منسوب کیا گیا ہے۔

باب چہارم

قرآن مجید کا دوسرے علوم سے تعلق

الف ـــ قرآن مجید کی طرف سے علم کی نسبت احترام اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب۔

ب ـــ وہ علوم جن کو حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید دعوت دیتا ہے۔

ج ـــ قرآن مجید سے متعلق خاص علوم۔

الف ـ قرآن مجید کی طرف سے علم کی نسبت احترام اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب

وہ عزت و احترام جو قرآن مجید نے علم و دانش کی نسبت اظہار کیا ہے اس کی مثال کسی بھی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی اور اس بارے میں یہی کافی ہے کہ قرآن مجید نے اسلام سے پہلے عربوں کی وحشت گری کے زمانے کو جاہلیت کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن مجید سینکڑوں آیات میں مختلف طریقوں سے علم و دانش کا نام لیتا ہے اور ان میں سے بہت زیادہ آیات میں علم و دانش کی عظمت کو نمایاں کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں پر احسان کرنے کے بارے میں فرماتا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝ (سورہ العلق ۵)
ترجمہ: انسان جو کچھ نہیں جانتا، ہم نے اسے سکھایا ہے۔ اور پھر فرماتا ہے: یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (سورہ مجادلہ آیہ ۱۱) ترجمہ: خدا تعالیٰ ان انسانوں کی

عظمت کو بہت بلند کرتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے مرتبوں کو چند گن زیادہ کرتا ہے اور آخر کار فرماتا ہے: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

(سورہ زمر آیہ ۹) ترجمہ: آیا جو لوگ صاحب علم ہیں اور جو لوگ علم نہیں جانتے، وہ دونوں برابر ہیں؟

اس بارے میں قرآنی آیات بہت زیادہ ہیں اور احادیث نبوی اور احادیث آئمہ اہلبیتؑ جو قرآن مجید کے بعد دوسرے درجہ پر ہیں، ان میں بھی بہت زیادہ ذکر آیا ہے۔

ب۔ وہ علوم جن کو حاصل کرنے کیلئے قرآن مجید دعوت دیتا ہے

قرآن مجید بہت زیادہ آیات ہیں (جن کی کثرت اور زیادتی کے باعث سب کو یہاں نہیں لکھ سکتے) جو انسان کو آسمان، درخشاں ستاروں اور ان کے درمیان عجیب وغریب پیدا ہونے والے اختلافات اور حالات اور ایسے ہی ان پر حاکم مضبوط نظام پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

زمین، سمندروں، پہاڑوں، بیابانوں اور تمام عجائبات کے متعلق جو زمین کے اندر موجود ہیں اور شب و روز کے اختلافات، موسموں کے تغیر و تبدل پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

اسی طرح عجیب وغریب نباتات اور ان میں موجود نظام زندگی کی فطرت اور حیوانات کے حالات و آثار اور ماحول کے بارے میں غور و فکر کرنے پر تشویق کرتی ہیں جو ان سے پیدا ہوتے ہیں۔

پھر انسانی پیدائش اور اس کے وجود میں چھپے ہوئے اسرار و رموز اور ان سے بڑھ کر ان باطنی دنیاؤں (قوتوں) میں جن کے ذریعے یہ انسان عالم بالا اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرتا ہے اور اسی طرح زمین کے اندر سیر کرنے اور گزشتہ قوموں، لوگوں کے آثار کا مشاہدہ، قوموں کے حالات و واقعات اور انسانی معاشروں، قصّوں، داستانوں اور تاریخی کتابوں میں تحقیق و تفتیش کرنے پر اصرار کرتی ہیں۔

اسی طرح علوم طبیعی، ریاضی، فلسفہ، فنون ادبی اور آخر کار ان تمام علموں کی تعلیم و تربیّت کی طرف بھی دعوت دیتی ہیں جو انسانی فکر کی دسترس میں واقع ہوں اور ان کو سیکھنا اور سکھانا، دنیائے انسانی اور انسانی معاشرے کی سعادت اور ترقی شمار ہوتے ہیں۔

ہاں! قرآن مجید ان تمام علوم کی طرف دعوت دیتا ہے بشرطیکہ وہ علوم انسان کو حق وحقیقت کی طرف ہدایت کر سکیں اور انسان ان سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ اور حقیقی جہان بینی کو جس کا نتیجہ خدا کی حقیقت کو سمجھنا ہے پا لیں ورنہ وہ علم جو انسان کو اپنے آپ میں مشغول رکھے اور حق وحقیقت کی شناخت سے منع کرے، قرآنی لغات میں جہل و نادانی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ○ (سورہ روم آیہ ۷) ترجمہ: وہ لوگ اس دنیا کی ظاہری زندگی کو ہی جانتے اور سمجھتے ہیں اور وہ اگلے جہان کی زندگی سے غافل ہیں۔ اور پھر فرماتا ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (سورہ جاثیہ آیہ ۲۳) ترجمہ: آیا تم نے دیکھا ہے ایسے شخص کو جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا خدا مان لیا ہو اور خدا نے اس کے علم کے باوجود اس کو گمراہ کر دیا ہو اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہو اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو، پس کون ہے جو خدا کے بغیر اس کی رہنمائی اور ہدایت کرے گا؟

قرآن کریم نے باوجود اس کے کہ مختلف علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، خود بھی معارفِ الٰہی، کلیاتِ اخلاق اور فقہ اسلامی کی تعلیم دینے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

ج ۔ قرآن مجید سے متعلق خاص علوم

مسلمانوں کے درمیان بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کا موضوع بحث خود قرآن مجید ہے۔ ان علوم کی تاریخ پیدائش قرآن مجید کے نزول کے دن سے شروع ہوئی ہے۔ اور آہستہ آہستہ ان کے مسائل لوگوں کے درمیان بڑھتے گئے اور عیب ونقص سے پاک ہو کر مکمل ہوتے گئے اور آخر کار ان علوم وفنون کے محققین نے ان کے بارے میں بےشمار کتابیں لکھی ہیں۔ ان علوم میں سے بعض قرآن مجید کے الفاظ کے متعلق ہیں اور بعض دوسرے اس کے معانی اور تحقیق کے بارے میں ہیں۔

وہ علوم جو قرآن مجید کے الفاظ وعبارات کے متعلق بحث کرتے ہیں ان کو "فنونِ تجوید" (قرآن کو صحیح طریقے

سے پڑھنا) اور "علم قرائت" کہتے ہیں۔ یہ فن حروف تہجّی کے تلفظ اور مختلف صورتوں اور کیفیتوں کے بارے میں ہے یعنی عربی زبان کے مفرد اور مرکّب الفاظ کا پیدا ہونا مثلاً حروف اور احکام وقف اور ابتداء وغیرہ کا آپس میں ملنے کے متعلق بحث کرتا ہے۔

ایک علم یا فن سات قسم کی مشہور قرائتوں اور دوسری تین قسم کی قرائتوں، صحابہ کرام کی قرائتوں اور شواذ کی قرائتوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔

ایک علم قرآن مجید کی سورتوں کی تعداد، کلمات، حروف اور آیات و کلمات و حروف کے بارے میں ہے۔

ایک علم یا فن خصوصاً قرآن مجید کے خاص رسم الخط اور عربی رسم الخط کے درمیان اختلاف کے متعلق بحث کرتا ہے۔

اور ایسے ہی دوسرے علوم جو قرآن مجید کے معانی کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ ایک علم یا فن قرآن مجید کی آیات کے مجموعی معانی مثلاً نزول، تاویل، ظاہر، باطن، محکم، متشابہ (آیات) ناسخ اور منسوخ کے بارے میں تحقیق کرتا ہے۔

اور ایک فن قرآن مجید کی آیات اور احکام کے بارے میں بحث کرتا ہے اور دراصل فقہ اسلامی کا ایک حصہ ہے۔

ایک اور علم یہ ہے کہ قرآنی آیات کے خاص معانی کیا ہیں اور اس کو "تفسیر قرآن" کہتے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے باب میں تفسیر اور مفسرین کے طبقات کے متعلق بحث ہو چکی ہے۔

اسلامی محققین اور علماء نے ہر ایک مندرجہ بالا علوم جو خاص کر قرآن مجید کے بارے میں ہیں۔ بے شمار کتابیں لکھی ہیں۔

د۔ وہ علوم جن کی پیدائش میں خود قرآن مجید ایک اہم عنصر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ دینی علوم جو آج مسلمانوں کے درمیان رائج اور قابلِ تعلیم و تعلّم ہیں، ان کی تاریخ اور رائج ہونا پیغمبر اکرمؐ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتی ہے اور ان میں معارفِ الٰہی اور قوانین شرعیہ شامل ہیں۔

یہ علوم پہلی صدی ہجری میں خلیفۂ اسلام کی طرف سے ممانعت کے باعث جو انہوں نے ان کی کتابت اور احادیث کی تالیف و تدوین وغیرہ پر نافذ کی تھی، صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان غیر منظم طور پر رائج اور جاری رہے اور

سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے فقہ، تفسیر اور حدیث کے متعلق مختصر طور پر کتابیں لکھی ہیں۔ اکثر لوگ ان کو سینہ بسینہ یاد اور نقل کرتے رہے۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں اس ممانعت کے اٹھ جانے سے[1] بعض لوگوں نے احادیث کو لکھنے، اور پھر دوسرے علوم کے بارے میں مباحث تالیف کرنے کی طرف توجہ دی اور ان کو منظم اور مرتب کیا۔ اس طرح فن حدیث اور علم رجال اور ایسے ہی فنِ اصولِ فقہ، علم فقہ، علم کلام وغیرہ وجود میں آئے۔

اور حتیٰ کہ فلسفہ بھی اگرچہ پہلے پہل یونانی زبان سے عربی زبان میں داخل ہوا اور کچھ مدت کے لئے یونانی صورت میں ہی قابل استفادہ رہا لیکن آہستہ آہستہ اسلامی ماحول اور طرزِ فکر میں ڈھل گیا۔ مادہ کے لحاظ سے بھی اور شکل و صورت کے لحاظ سے بھی اس میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ وہ فلسفہ جو آج کل مسلمانوں کے درمیان رائج اور جاری ہے اس میں معارف الٰہی کے بارے میں کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا مگر یہ کہ اس کے متن اور دلائل و براہین کو جو اس کے ثابت کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، ان کو قرآن و احادیث میں پیدا کر کے ان میں سے وہ فلسفہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کو عربی زبان کے ادبی علوم میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ علم صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع، لغت، فن فقہ لغت (فلالوجی) اور اشتقاق وغیرہ۔ اگرچہ ان سب کا موضوعِ بحث مطلق عربی کلام ہی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جس چیز نے لوگوں کو ان علوم کے اصول و قوانین لکھنے، تصفیہ اور تتبع کرنے پر ترغیب دی، وہی خدائی شاہکار ہے جس نے لوگوں کو اپنے شیریں بیان، خوبصورت اسلوب اور روش کا شیفتہ بنا لیا تھا اور لوگوں کو کلمات و تراکیب اور معانی و الفاظ، فصاحت و بلاغت اور لفظی صنائع کے واضح کرنے کی خاطر اس امر کی ضرورت پیش آئی تھی کہ ان کے کلی قوانین کو ان مثالوں سے جو عربی زبان میں موجود تھیں حاصل کریں اور اسی طرح صرف و نحو، لغت اور دوسرے تین فنون یعنی بلاغت، تنقیح اور تنظیم پیدا ہوئے۔

روایت ہے کہ ابن عباس جو مفسر صحابہ کرام میں سے تھے، آیات کے معانی کو عربی اشعار سے مثالوں کے ذریعے بیان کیا کرتے تھے اور اسی طرح عربی اشعار کو جمع کرنے کی تلقین اور تاکید کرتے تھے اور فرماتے تھے: "اَلشِّعْرُ

---

[1] یہ ممانعت (جیسا کہ تاریخ میں موجود ہے) حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ (۹۹ - ۱۰۱ھ) نے اٹھائی تھی۔

باب پنجم

قرآن مجید کے نزول کی ترتیب

اور عوام میں اس کا رائج ہونا

۱ — قرآن مجید کی آیات کس ترتیب سے نازل ہوئی ہیں ؟

۲ — گزشتہ بحث سے متعلق۔

۳ — اسباب نزول۔

۴ — سورتوں کے نزول کی ترتیب۔

۵ — روایت اور دوسری روایتوں کے بارے میں ایک نظر۔

۶ — قرآن مجید کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کرنا۔

۷ — آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد۔

۸ — قرآن مجید کے بارے میں مسلمانوں کا اہتمام۔

۹ — قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ اور پاک ہے۔

۱۰ — قرأتِ قرآن اور اس کی روایت کی حفاظت۔

۱۱ — قاریوں کے طبقات۔

۱۲ — قراء سبعہ (سات قسم کی مشہور قرأتیں

۱۳۔ قرآنی آیات کی تعداد۔

۱۴۔ قرآنی سورتوں کے نام۔

۱۵۔ قرآن مجید کا رسم الخط اور اعراب (علامتیں)۔

۱۔ قرآن مجید کی آیات کس ترتیب سے نازل ہوئی ہیں؟

قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں ایک ہی بار نازل نہیں ہوئی ہیں۔ یہ مطلب قرآن مجید کے تدریجی نزول کی قطعی تاریخ پر جو پیغمبر اکرمؐ کی تیئیس ۲۳ سالہ دعوتِ اسلام کا زمانہ ہے، شہادت دیتا ہے، اور خود آیات کے مضامین سے بھی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ (سورہ بنی اسرائیل ۱۰۶) ترجمہ: اور ہم نے قرآن کی سورتوں اور آیتوں کو ایک دوسری سے جدا کر دیا تاکہ ان کو موقع کے مطابق عوام کے لئے تلاوت کریں اور ہم نے اس (قرآن) کو بتدریج نازل کیا۔

قرآن مجید میں ناسخ اور منسوخ بھی موجود ہے اور ایسی آیات بھی ہیں جو بعض قصوں، داستانوں اور حادثات و واقعات سے متعلق ہیں جو ہرگز ایک زمانے میں وقوع پذیر نہیں ہو سکتے کہ اس سے متعلق آیات یا سورتیں ایک دفعہ نازل ہوں۔ ان کے بارے میں ہم یہاں بحث کریں گے۔

اور اسی طرح قرآنی سورتیں اور آیات جس ترتیب سے قرآن مجید میں جمع کی گئی ہیں، اس ترتیب سے نازل نہیں ہوئی تھیں یعنی سب سے پہلے سورہ حمد، اس کے بعد سورہ بقرہ، آل عمران وغیرہ ہیں اس ترتیب سے نازل نہیں ہوئی تھیں۔

کیونکہ اس بارے میں قطعی شہادت کے علاوہ خود آیات کے مضامین بھی گواہی دیتے ہیں کہ قرآن مجید کی کی بعض سورتیں اور آیتیں جو آنحضرتؐ کی بعثت کے ابتدائی زمانے کے مناسب ہیں مثلاً سورہ علق، نون جو قرآن مجید کے آخر میں جمع کی گئی ہیں اور دوسری بہت سی آیات اور سورتیں جن کے مضامین ہجرت کے بعد اور رسول اکرمؐ کے آخری عہد سے متعلق ہیں مثلاً سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، انفال اور توبہ وغیرہ جو قرآن کریم کی ابتدا میں جمع کی گئی ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ ان مضامین کے بموجب قرآنی آیات کی مختلف سورتیں اور آیتیں اپنے نزول کے لحاظ سے

ان گوناگوں حوادث، وقائع اور احتیاجات وضروریات سے مکمل رابطہ رکھتی ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانۂ دعوتِ اسلام میں رونما ہوئے تھے۔

مثلاً ایسی سورتیں اور آیات جو صرف مشرکین کو دعوت دینے اور بت پرستی کا مقابلہ کرتے پر مشتمل ہیں۔ پیغمبرؐ اکرم کی ہجرت سے پہلے کے زمانے کے ساتھ زیادہ مناسب ہیں، جب آپؐ مکّہ معظمہ میں بت پرستوں کو دعوتِ اسلام دینے میں مصروف تھے اور جنگ وجہاد اور احکام پر مبنی آیات جو حوادث اور ضروریاتِ زندگی پر مشتمل ہیں، ہجرت کے بعد شہر یثرب (مدینہ منورہ) میں اسلامی معاشرہ وجود میں آنے اور اسلام کی روز افزوں ترقی کے بعد نازل ہوئی ہیں۔

۲ـــ گزشتہ بحث کے بارے میں

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، قرآنی آیات اور سورتیں، محلِ نزول، زمانِ نزول اور اسباب وشرائط میں اختلاف کے لحاظ سے جو قرآن کے نزول کی علت کو فراہم کرتے ہیں، تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے:۔

۱۔ بعض سورتیں اور آیات مکّی ہیں (یعنی شہر مکّہ معظمہ میں نازل ہوئی ہیں) اور بعض مدنی (مدینہ منورہ میں نازل شدہ) ہیں اور عام طور پر قرآن مجید کا وہ حصہ جو حضرت پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت سے پہلے نازل ہوا ہے اس کو مکّی کہا جاتا ہے، اس میں زیادہ تر قرآنی سورتیں اور خصوصاً چھوٹی سورتیں شامل ہیں اور جو حصہ آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اس کو مدنی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ مدینہ کے باہر یا چاہے شہر مکّہ میں ہی کیوں نہ نازل ہوا ہو۔

۲۔ بعض سورتیں اور آیات سفر میں اور بعض حضر میں نازل ہوئی ہیں اور اسی طرح کچھ سورتوں اور آیتوں کی تقسیم یوں بھی ہوتی ہے کہ یہ دن کے وقت نازل ہوئی ہیں یا رات کے وقت اور صلح کے زمانے میں نازل ہوئی ہیں یا جنگ کے موقع پر اور کیا وہ زمین پر نازل ہوئی ہیں یا آسمان پر (واقعہ معراج کے دوران) اور کیا وہ خلوت اور تنہائی میں نازل ہوئی ہیں یا لوگوں کے جمگھٹے میں۔ اور ہم ان تقسیمات کو پہچاننے کا فائدہ "اسبابِ نزول" کے باب میں بحث کرینگے۔

۳۔ دو سورتوں کے بعض حصے مکرر نازل ہوئے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سورۂ حمد دو مرتبہ نازل ہوئی ہے۔ ایک بار مکّہ میں اور دوسری بار مدینہ میں اور اسی طرح بعض آیات چند بار نازل ہوئی ہیں جیسا کہ آیہ فَبِاَیِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ○ سورہ رحمٰن میں تیس مرتبہ آئی ہے۔ اور ایسے ہی دو آیات اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ط

وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ سورہ شعراء میں آٹھ بار تکرار ہوئی ہیں اور کبھی ایک ہی آیت ایک سے زیادہ سورتوں میں کئی بار آئی ہے جیسا کہ آیۂ شریفہ : وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ چھ مختلف سورتوں میں نازل ہوئی ہے۔

اور اسی طرح کبھی کبھی ایک فقرہ کسی جگہ مکمل آیت کی صورت میں اور کسی جگہ آیت کے جزو کے طور پر آیا ہے مثلاً فقرہ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ایک دفعہ سورۂ آل عمران کے آغاز میں مکمل آیہ کی صورت میں اور ایک دفعہ سورۂ بقرہ میں آیت الکرسی کا جزء ہے لیکن اکثر سورتیں اور آیات ایک ہی دفعہ نازل ہوئی ہیں اور ایک ہی موقع سے تجاوز نہیں کرتیں۔

بہرحال قرآنی آیات میں اس قسم کے اختلافات بعض مختلف مقام بیانات کے تقاضوں کا نتیجہ ہیں کہ کبھی ایک جگہ ایک فقرے کے تکرار کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اور کلام کا تکیہ گاہ بنایا گیا ہے اور کبھی نہیں۔

اور اس قسم کے اختلافات کی مثال ایک اور اختلاف ہے جو قرآنی سورتوں اور آیات کے درمیان میں کبھی زیادہ ہے اور کبھی کم مثلاً سورۂ کوثر جو سب سے چھوٹی سورت ہے اور سورہ بقرہ جو سب سے بڑی ہے اور اسی طرح آیہ مُدْهَآمَّتٰنِ جو سب سے چھوٹی قرآنی آیت ہے اور صرف ایک ہی لفظ پر مشتمل ہے "اور آیۂ دین" جو سورہ بقرہ کی ۲۸۲ ویں اور قرآن کی سب سے بڑی آیت ہے اور تیس سے زیادہ فقروں پر مشتمل ہے۔

یہ سب اختلافات مقام بیان کا تقاضا ہیں جیسا کہ کبھی دو متصل آیات کے درمیان یہ واقعہ رونما ہوتا ہے مثلاً دو آیاتِ کریمہ نمبر ۲۰ اور ۲۱ سورۂ مدثر کہ پہلی صرف ایک ہی فقرہ ہے اور دوسری پندرہ فقروں سے بھی زیادہ ہے۔

اس قسم کا اختلاف وہ اختلاف ہے کہ جو قرآنی سورتیں اپنے اختصارِ کلام اور طولِ کلام کے لحاظ سے رکھتی ہیں چنانچہ سورہ فجر اور سورہ لیل کا سورہ بقرہ اور سورہ مائدہ سے مقابلہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے لہٰذا اکثر مکی سورتیں اختصار کے طریقے پر اور اکثر مدنی سورتیں طولِ کلام کے اسلوب پر نازل ہوئی ہیں۔

اسی طرح جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سب سے پہلی آیات جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی ہیں، سورہ علق یا سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات ہیں اور آخری آیت جو نازل ہوئی ہے وہ یہ آیۂ کریمہ : وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (سورہ بقرہ آیہ ۲۸۱)

۳ــــ اسبابِ نزول

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے قرآنی سورتوں اور آیات میں سے بہت زیادہ اپنے نزول کے لحاظ سے واقعات اور حوادث سے مرتبط ہیں جو دعوتِ اسلام کے زمانے میں رونما ہوئے مثلاً سورہ بقرہ[1]، سورہ حشر اور سورہ عادیات وغیرہ یا اسلامی احکام اور اسلامی قوانین کی وضاحت کے پیشِ نظر ان سورتوں کے نزول کی ضرورت پیدا ہوئی ہے تاکہ ضروری احکام کو بیان کریں مثلاً سورہ نساء[2]، سورہ انفال اور سورہ طلاق وغیرہ۔

وہ دلیل اور وجہ جس کی بناء پر سورہ یا آیت نازل ہوتی ہے اس کو "اسبابِ نزول" کہتے ہیں البتہ اس کا جاننا ایک اندازے کے مطابق انسان کو علتِ نزول اور آیت کے مضمون خصوصاً علتِ نزول کے بارے میں واضح اور مدد کرتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام کے اوائل میں محدثین صحابہ اور تابعین کے بہت سے گروہوں نے روایات اور اسباب نزول کے لکھنے میں کمرِ ہمت باندھی تھی۔ اس بارے میں بہت زیادہ احادیث و روایات نقل کی گئی ہیں۔

یہ روایات اہلسنت کے ذریعے بہت زیادہ ہیں اور ان کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے لیکن شیعہ ذریعے سے بہت کم ہیں، شاید ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ ہو، البتہ سب روایات مستند اور صحیح نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بہت زیادہ غیر مستند اور ضعیف ہیں۔ ان روایات کی پیروی اور ان کے بارے میں غور و خوض انسان کو بدبین کر دیتا ہے۔

سب سے پہلے تو ان روایات میں سے بہت زیادہ روائتوں کے سیاق و سباق سے یہ چیز واضح ہے کہ راوی نے آیت کے نزول کے متعلق کسی ایک حادثے یا واقعے کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا یا اس کی اپنی زندگی میں وہ واقعہ پیش نہیں آیا بلکہ وہ ایک قصے یا داستان کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد اس قصے یا واقعے کی مناسبت سے ان

---

[1] سورہ بقرہ سال اوّل ہجری مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔ اس سورہ کی کچھ آیات یہودیوں کی سرزنش کے بارے میں ہیں جو اسلام کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتے تھے اور کچھ آیات احکام کی تشریح اور وضاحت میں ہیں جیسا کہ قبلہ کی تبدیلی، روزہ اور حج کی وضاحت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ سورہ حشر قبیلہ بنی نضیر کے یہودیوں کو باہر نکالنے اور سورہ عادیات وادی یابس میں مقیم عربوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

[2] سورہ نساء خصوصاً عورتوں کے ازدواج (شادیوں) سورہ انفال جنگی قیدیوں اور مال غنیمت اور سورہ طلاق خصوصاً طلاق کے بارے میں نازل ہوئی۔

آیات کو بیان کرتا ہے ، جو معنی کے لحاظ سے مرتبط ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو سبب نزول حدیث میں ذکر ہوا ہے وہ صرف اجتہادی اور نظری ہے نہ کہ ایسا سبب نزول جو مشاہدے اور حقیقی طریقے سے ہاتھ آیا ہو۔

اس کلام کا گواہ اور شاہد یہ ہے کہ ان روایات کے درمیان بہت زیادہ تناقض نظر آتا ہے اس طرح کہ بہت زیادہ قرآنی آیات کے بارے میں کئی متناقض سبب نزول لکھے گئے ہیں جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے حتیٰ کہ کبھی کبھی ایک شخص مثلاً ابن عباس یا ان کے علاوہ دوسرے اشخاص سے ایک خاص آیت کے بارے میں کئی اسباب نزول روایت کئے گئے ہیں۔

ان متناقض اور پے در پے اسباب نزول کا داخل ہونا دو احتمالات میں سے باہر نہیں ہے۔ یا تو یہ کہنا چاہئے کہ یہ اسباب نزول نظری (عقیدتی) ہیں نہ کہ عقلی، اور ان متناقض روایات کے راویوں کے ایک آیت کو خاص مناسب قصوں سے مرتبط کر دیا ہے جو دوسری روایات میں آنے والے قصوں کے بالکل برخلاف ہیں یا اسی طرح اگر ایک شخص نے دو مختلف اسباب نزول بیان کئے ہیں تو وہ مختلف نظریات میں الجھ گیا ہے، اس طرح اس نے عقیدے کے بعد دوسرے عقیدے کی طرف رخ کر لیا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ ساری روائتیں یا ان میں سے بعض روایات جعلی اور مصنوعی ہیں۔

ان احتمالات کے ثابت اور معلوم ہونے سے اسباب نزول کے بارے میں روایات پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے لہٰذا اس طرح حتیٰ کہ حدیث کا مستند ہونا بھی کوئی فائدہ نہیں دیتا کیونکہ سند کے صحیح ہونے کے احتمال کو بھی صاحب سند کا جھوٹ، سند کو ختم کر دیتا ہے یا اس کو ضعیف کر دیتا ہے لیکن جعل اور تصنع کا احتمال اپنی جگہ پر باقی ہے۔

دوسرے یہ کہ صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اوائل اسلام میں خلیفہ (دوم) نے حدیث کو بیان کرنے یا لکھنے پر سخت پابندی عائد کر دی تھی اور جہاں کہیں بھی کوئی کاغذ یا تختی جس پر حدیث لکھی ہوتی تھی، نظر آجاتی یا ملتی تو اس کو فوراً ضبط کر کے جلا دیا جاتا تھا۔ یہ پابندی پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ۹۰ سال تک جاری رہی۔

اس روش نے ضرورت سے زیادہ حقیقی احادیث کو لکھنے کا راستہ راویوں اور محدثین کی روایتوں کے لئے کھول دیا اور وہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو ایک ہی حدیث کو بار بار نقل کرنے سے پیدا ہوتی رہیں، آہستہ آہستہ زیادہ ہوتی رہیں اور کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا کہ حدیث کا اصلی مطلب ہی فوت ہو جاتا اور یہ مطلب روایات میں موجود ان

قصّوں اور داستانوں کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہوجاتا ہے جو مختلف راہوں سے ان میں داخل ہوگئے ہیں، انسان کبھی کبھی ایسی روایات سے آشنا ہوتا ہے کہ وہ جس قصے یا واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اس کے بارے میں قطعی ثبوت اور جامعیت نہیں رکھتیں، البتہ معنی اور مفہوم کے لحاظ سے بار بار نقل کے طریقے کا رواج، اسبابِ نزول کے لئے کوئی اعتماد ہی باقی نہیں چھوڑتا (یعنی اسبابِ نزول کا اعتماد اور اعتبار اس طریقے سے بالکل ختم ہوجاتا ہے) یا کم از کم اس کے اعتبار و اعتماد کو کم کردیتا ہے۔

اور جب جعل، تصنّع، خصوصاً اسرائیلی داستانیں اور منافقین کی طرف سے جعلی اور بناوٹی دستاویزیں جو ظاہراً پہچانی نہیں جاتی تھیں، روایات واحادیث میں شامل ہوگئیں تو معنی کے لحاظ سے نقل کے مسئلے اور مندرجہ بالا مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس طرح سبب نزول کا اعتماد بھی اٹھتا چلا گیا۔

۴ ـــــ سورتوں کے نزول کی ترتیب

البتہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآنی سورتیں اور آئیتیں جس ترتیب سے پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی ہیں، اسی ترتیب سے مصحف (قرآن مجید) میں نہیں لکھی گئیں۔

پہلے اسلامی دانشمندوں خصوصاً علمائے اہلسنّت نے سورتوں اور آیات کی ترتیبِ نزول کے متعلق روایات پر اعتماد کیا ہے، ان حاصل شدہ روایات میں سے ایک روایت ابن عباس کی ہے جو کہتے ہیں:[1]

"مکہ میں نازل ہونے والی ہر سورت کا آغاز وہیں لکھا جاتا تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ جو چاہتا اس پر بڑھا دیتا۔"

اور سب سے پہلی سورت جو قرآن مجید میں سے نازل ہوئی وہ یہ ہے:۔

۱ ـــــ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ـــــ اس کے بعد

۲ ـــــ نٓ ـــــ "

۳ ـــــ يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ـــــ "

---

[1] کتاب اتقان جلد اوّل صفحہ ۱ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۷۰ھ۔ نقل از کتاب فضائل القرآن ابن ضریس۔

۴ ——— يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ اس کے بعد
۵ ——— تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ 〃
۶ ——— اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ 〃
۷ ——— سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى 〃
۸ ——— وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى 〃
۹ ——— وَالْفَجْرِ 〃
۱۰ ——— وَالضُّحٰى 〃
۱۱ ——— اَلَمْ نَشْرَحْ 〃
۱۲ ——— وَالْعَصْرِ 〃
۱۳ ——— وَالْعَادِيَاتِ 〃
۱۴ ——— اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ 〃
۱۵ ——— اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ 〃
۱۶ ——— اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ 〃
۱۷ ——— قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ 〃
۱۸ ——— اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ 〃
۱۹ ——— قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ 〃
۲۰ ——— قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ 〃
۲۱ ——— قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ 〃
۲۲ ——— وَالنَّجْمِ 〃
۲۳ ——— عَبَسَ 〃
۲۴ ——— اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ 〃

۲۵	وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا	اس کے بعد
۲۶	وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ	"
۲۷	وَالتِّيْنِ	"
۲۸	لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ	"
۲۹	اَلْقَارِعَةُ	"
۳۰	لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ	"
۳۱	وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ	"
۳۲	وَالْمُرْسَلَاتِ	"
۳۳	قٓ	"
۳۴	لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ	"
۳۵	وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ	"
۳۶	اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ	"
۳۷	صٓ	"
۳۸	اِعْرَافِ	"
۳۹	قُلْ اُوْحِيَ	"
۴۰	يٰسٓ	"
۴۱	فُرْقَانِ	"
۴۲	مَلٰئِكَةَ	"
۴۳	كٓهٰيٰعٓصٓ	"
۴۴	طٰهٰ	"
۴۵	وَاقِعَةِ	"

۴۶ ______ طسمٓ شعرآ ______ اس کے بعد

۴۷ ______ طسٓ ______ //

۴۸ ______ قصص ______ //

۴۹ ______ بنی اسرائیل ۔ اسرا ______ //

۵۰ ______ یونس ______ //

۵۱ ______ ھود ______ //

۵۲ ______ یوسف ______ //

۵۳ ______ حجر ______ //

۵۴ ______ انعام ______ //

۵۵ ______ صافات ______ //

۵۶ ______ لقمٰن ______ //

۵۷ ______ سبأ ______ //

۵۸ ______ زمر ______ //

۵۹ ______ حمٓ مؤمن ______ //

۶۰ ______ حمٓ سجدۃ ______ //

۶۱ ______ حمٓعسٓق ______ //

۶۲ ______ حمٓ زخرف ______ //

۶۳ ______ دخان ______ //

۶۴ ______ جاثیۃ ______ //

۶۵ ______ احقاف ______ //

۶۶ ______ ذاریات ______ //

۶۷	غَاشِیَۃِ	اس کے بعد
۶۸	کَہْفِ	〃
۶۹	نَحْل	〃
۷۰	اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا	〃
۷۱	اِبْرَاهِیْمَ	〃
۷۲	اَنْبِیَاء	〃
۷۳	مُؤْمِنُوْنَ	〃
۷۴	تَنْزِیْلُ سَجْدَہ	〃
۷۵	طُوْر	〃
۷۶	تَبَارَک (مُلْک)	〃
۷۷	اَلْحَاقَۃُ	〃
۷۸	سَاَلَ	〃
۷۹	عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ	〃
۸۰	نَازِعَات	〃
۸۱	اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ	〃
۸۲	اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ	〃
۸۳	رُوْمُ	〃
۸۴	عَنْکَبُوْت	〃
۸۵	وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ	〃
۸۶	بَقَرَۃ	〃
۸۷	اَنْفَال	〃

۸۸	آلِ عِمرَان	اس کے بعد
۸۹	اَحزَاب	〃
۹۰	مُمتَحِنَة	〃
۹۱	نِسَآء	〃
۹۲	اِذَا زُلزِلَت	〃
۹۳	حَدِید	〃
۹۴	قِتَال	〃
۹۵	رَعد	〃
۹۶	الرَّحمٰن	〃
۹۷	اِنسَان	〃
۹۸	طَلَاق	〃
۹۹	لَم یَکُن	〃
۱۰۰	حَشر	〃
۱۰۱	اِذَا جَاءَ نَصرُاللہِ	〃
۱۰۲	نُور	〃
۱۰۳	حَجّ	〃
۱۰۴	مُنَافِقُون	〃
۱۰۵	مُجَادِلَة	〃
۱۰۶	حُجُرَات	〃
۱۰۷	تَحرِیم	〃
۱۰۸	جُمُعَة	〃

۱۰۹ــــــ تغابن اس کے بعد

۱۱۰ ــــــ صف ″

۱۱۱ ــــــ فتح ″

۱۱۲ ــــــ مائدۃ ″

۱۱۳ــــــ برأت (نمل)

۵ــــ روایت اور دوسری روایتوں کے بارے میں ایک نظر

گزشتہ روایت جو ابن عباس سے نقل کی گئی ہے اس میں ایک سو تیرہ[۱۱۳] سورتوں کا ذکر آیا ہے اور سورہ حمد کو ان میں شمار نہیں کیا گیا۔

ایک اور روایت جو بیہقی[۱] نے عکرمہ سے نقل کی ہے اس میں ایک سو گیارہ سورتوں کو شمار کیا گیا ہے اور تین سورتوں یعنی سورۂ حمد، سورۂ اعراف اور سورہ شوریٰ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اور اسی روایت کو بیہقی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے اور یہ روایت ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل ہے لیکن بیہقی کی دونوں روایتوں میں ایک تو سورۂ مطففین کو مدنی سورتوں میں شمار کیا گیا ہے، برخلاف گزشتہ روایت کے مذکورہ سورت کو مکی کہا گیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ مکی اور مدنی سورتوں کی ترتیب جو ان روائتوں میں آئی ہے گزشتہ ترتیب سے بہت ہی مختلف ہے۔

ایک اور روایت علی بن ابی طلحہ سے نقل کی گئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے:

"سورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، سورہ مائدہ، سورہ انفال، سورۂ توبہ، سورہ حج، سورۂ نور، احزاب، والذین کفروا، فتح، حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، حواریین

---

[۱] اتقان جلد اول صفحہ ۱۰۔

(صف) ، تغابن ، یاایہاالنبی اذ طلقتم النساء ، یاایہا النبی لم تحرم ، فجر ، لیل ، انا انزلناہ فی لیلۃ القدر ، لم یکن ، اذ زلزلت ، اذا جاء نصراللہ اور دوسری سبھی قرآنی سورتیں مکہ میں نازل ہوئی ہیں۔"

یہ روایت شاید صرف مکّی سورتوں کو مدنی سورتوں سے الگ کرنے کی خاطر بیان کی گئی ہے نہ کہ سورتوں کے نزول کی ترتیب کو بیان کرنے کے لئے ، ورنہ سورہ مائدہ اور توبہ کی جگہ (ترتیب) اس سے بہت نیچے ہوئی جس ترتیب سے وہ بیان کی گئی ہیں۔

ان کے علاوہ سورہ فجر ، سورہ لیل اور سورہ قدر کو مدنی آیتوں میں شمار کیا گیا تھا اور اسی طرح سورۂ رعد ، سورہ رحمٰن ، سورہ انسان ، سورہ جمعہ اور سورہ حجرات کو مکی سورتیں کہا گیا ہے ، حالانکہ گزشتہ روایتوں میں ان کو مدنی کہا گیا تھا۔

ایک اور روایت میں جو[1] قتادہ سے نقل ہوئی ہے کہا جاتا ہے :

"قرآن مجید کی سورتوں میں سے سورۂ بقرہ ، آل عمران ، نساء ، مائدہ ، برائت ، رعد ، نحل ، حج ، نور ، احزاب ، محمدؐ ، فتح ، حجرات ، حدید ، رحمٰن ، مجادلہ ، حشر (تیرہ آیات تک) ، اذا زلزلت ، اور اذا جاء نصراللہ مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور باقی سارا قرآن مکّہ میں نازل ہوا ہے۔"

یہ روایت بھی دوسری گزشتہ روایات اور خصوصاً خود قتادہ کی روایت سے جو مطففین ، انسان اور لم یکن کے بارے میں بیان کی گئی ہے ، مخالف ہے۔

ان روایات کے بارے میں جو چیز واضح طور پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایات ہرگز قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ نہ تو دینی روایت کی قدر و منزلت انہیں حاصل ہے اور نہ ہی وہ تاریخی طور پر ثبت کئے جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ دینی روایت کے لحاظ سے یہ روایات پیغمبر اکرمؐ سے منسوب کئے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں کیونکہ معلوم نہیں ابن عباس نے اس ترتیب کو خود پیغمبر اکرمؐ سے سیکھا ہے یا کسی اور سے ، اور اگر دوسروں سے سیکھا ہے تو معلوم نہیں وہ لوگ کون تھے یا اپنے عقیدے اور اجتہاد کے ذریعے ان کو لکھا ہے

---

[1] اتقان جلد اول صفحہ ۱۱۔

اور اس صورت میں یہ روایت صرف ان کے اپنے لئے ہی قابلِ اعتماد اور قابلِ اعتبار ہے۔

لیکن تاریخی اعتبار سے نقل کرنے کی قدر و قیمت یہ ہے کہ چونکہ ابن عباس پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے ایک تھوڑے عرصے میں آپ کے صحابی رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان تمام سورتوں کے نزول کے عینی گواہ نہیں رہے اور اگر انہوں نے اس ترتیب کو اپنے عقیدے اور اجتہاد کے ذریعے بھی حاصل نہ کیا ہو تو ظاہر ہے کہ دوسروں سے سنا ہے لہٰذا یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہے اور تاریخی لحاظ سے بھی یہ روائیت بالکل اہمیّت نہیں رکھتی ۔

ان کے علاوہ یہ روایات اگر بالفرض صحیح اور محکم بھی ہوں تو بھی ایک اکیلے شخص سے حاصل ہوئی ہیں اور علم اصول کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی کوئی حدیث اور روایت (جو ایک ہی راوی سے ملی ہو) شرعی احکام کے علاوہ ان کی کوئی اہمیّت نہیں ہو سکتی ۔

پس گزشتہ بیان کے مطابق صرف ایک ہی طریقہ باقی ہے جس کے ذریعے قرآنی سورتوں کا مکی یا مدنی ہونا ثابت ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سورتوں کے مضامین میں مکمل غور و خوض اور ان کو ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد میں رونما ہونے والے واقعات و حالات سے پرکھا جائے ۔ یہ طریقہ قرآنی آیات کی ترتیب کے مکّی یا مدنی ہونے کی تشخیص کے لئے سود مند ہے، جیسا کہ سورہ انسان، العادیات اور مطففین کے مضامین خود بخود ان کے مکّی ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض نقل شدہ روایات کے مطابق ان کو مکّی کہا گیا ہے۔

۶۔ قرآن مجید کو ایک مصحف (جلد) میں جمع کرنا (آنحضرت کی رحلت سے پہلے)

قرآن مجید جو کہ ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت کے طور پر نازل ہوتا تھا، اپنی خارق العادت فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کی شہرت ان عربوں کے درمیان روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی جو کلام کی فصاحت و بلاغت رکھتے تھے یا اس کے شیفتہ تھے اور لوگ قرآن مجید کی چند آیات سننے کے لئے دور دور سے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آتے تھے تاکہ ان آیات کو یاد کریں۔

اور اسی طرح شہر مکّہ کے بزرگ لوگ اور قریش کے با اثر حضرات دعوتِ اسلامی کے سخت ترین دشمن اور

بت پرست تھے اور جہاں تک ان کا بس چلتا تھا لوگوں کو پیغمبر اکرمؐ کے پاس جانے سے روکتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مجید (نعوذ باللہ) جادو ہے اور اس طرح عربوں کو اس جادو کی کتاب کے سننے سے ڈرایا کرتے تھے۔

ان تمام رکاوٹوں کے باوجود عوام رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ایک دوسرے سے حتیٰ کہ اپنے خاندانوں اور خویش واقارب سے چھپ کر آتے اور پیغمبر اکرمؐ کے مکان کے نزدیک بیٹھ جایا کرتے تھے تاکہ جب آنحضرتؐ قرآن کی تلاوت کریں تو اسے سنیں[1]۔

مسلمان چونکہ قرآن مجید کو خدا کا کلام اور واحد دینی سند سمجھتے تھے اور فریضہ نماز میں اور سورہ حمد اور پھر قرآن کا کچھ حصہ تلاوت کرتے اور پھر اسلئے کہ[2] پیغمبر اکرمؐ کا مشن تھا کہ قرآن مجید اور اسلامی احکام ان عوام کو سکھائیں لہٰذا قرآنی آیات اور سورتوں کو زبانی یاد کر کے ان کو محفوظ رکھنے کیلئے بہت زیادہ کوشش اور جدوجہد کرتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ کے مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے اور ایک مستقل اسلامی معاشرہ وجود میں آنے کے بعد یہ طریقہ زیادہ منظم اور پختہ ہو گیا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے اصحاب کی ایک بہت بڑی جماعت قرآن مجید کی قرأت اور اسلامی احکام کی تعلیم و تعلّم پر مامور ہوئی۔ چونکہ یہ اسلامی احکام دن بدن نازل اور مکمل ہوتے جاتے تھے اور حتیٰ کہ قرآن مجید کے صریح حکم کے مطابق یہ اصحاب جنگ اور جہاد میں شرکت کرنے سے معاف ہو جاتے تھے[3]

چونکہ پیغمبر اکرمؐ کے بہت زیادہ اصحاب اور خصوصاً وہ اصحاب جو مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے، ان پڑھ تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کی ہدایت کے مطابق یہودی جنگی قیدیوں سے استفادہ کیا جاتا تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھائیں۔ اس زمانہ کا رسم الخط بہت سادہ اور آسان تھا۔ اس طرح ایک پڑھی لکھی جماعت وجود میں آ گئی۔

اس جماعت میں سے وہ لوگ جو قرآن مجید کی قرأت اور اس کو حفظ اور زبانی یاد کرنے اور ایسے ہی سورتوں اور آیات کو یاد کرنے میں مشغول تھے ان کو "قاری" کہا جاتا تھا اور اس گروہ میں سے ہی "بِئرِ مَعُونَا"

---

[1] درالمنثور جلد چہارم صفحہ ۱۸۷۔

[2] سورہ نحل آیہ ۴۴ اور دوسری بہت سی آیات۔

[3] سورہ توبہ آیہ ۱۲۲۔

کے واقعے میں چالیس یا ستر افراد ایک ہی بار شہید ہو گئے تھے[1]۔

قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہو چکا تھا یا تدریج نازل ہو رہا تھا اس کو تختیوں، اونٹ کی ہڈیوں اور کھجوروں کے پتوں وغیرہ پر لکھا جاتا تھا اور اس طرح اس کو محفوظ کر لیا جاتا تھا۔

وہ چیز جس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور قابلِ تردید بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ اکثر قرآنی سورتیں حضرت پیغمبر اکرمؐ کی رحلت سے پہلے مسلمانوں کے درمیان رائج اور مشہور تھیں، بلکہ سیکڑوں اور سینکڑوں احادیث میں اہلسنت اور شیعہ ذرائع سے پیغمبر اکرمؐ کی تبلیغ اسلام یا آپؐ کی رحلت سے پہلے آپؐ کے صحابہ کرام اور ایسے ہی ان نمازوں کے بارے میں جو آپؐ نے پڑھیں اور آپؐ نے پڑھیں اور آپؐ کی سیرت پاک کے بارے میں ان سورتوں کے نام آئے ہیں۔

اور اسی طرح[2] وہ نام جو ان مختلف سورتوں کے بارے میں اوائل اسلام میں مشہور تھے مثلاً سورہ طوال، مئین، مثانی اور مفصلات وغیرہ پیغمبر اکرمؐ کی احادیث میں جو آپؐ کے زمانے میں مشہور ہو گئی تھیں بہت زیادہ دیکھے جاتے ہیں۔

۷۔ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد

(پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ[3] جو قرآن مجید کی قطعی آیات اور پیغمبر اکرمؐ کی تصدیق کے مطابق تمام افراد سے زیادہ قرآن مجید سے آشنا اور واقف تھے، اپنے گھر میں الگ تھلگ ہو کر قرآن مجید کی ترتیب کو ایک جلد میں جمع کرنے میں مشغول تھے اور ابھی آنحضرتؐ کی رحلت کو چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ آپ نے جو مصحف مرتب کیا تھا، اس کو اونٹ پر لاد کر لوگوں کو دکھایا[4]۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد ایک سال[5] اور کچھ مہینے گزرے تھے کہ جنگ یمامہ شروع ہو گئی اس جنگ میں ستر[6] قاری شہید ہو گئے۔ خلیفۂ وقت نے اس ڈر سے کہ ممکن ہے ایک اور جنگ شروع ہو جائے اور باقی ماندہ قاری بھی ہلاک ہو جائیں اور اس کے باعث قرآن مجید بھی محو ہو جائے، سوچا کہ قرآن کی سورتوں اور آیات کو ایک مصحف (جلد) میں جمع

---

[1] اتقان جلد اول۔ صفحہ ۷۲۔

[2] اتقان جلد اول۔ صفحہ ۶۵۔

[3] اتقان جلد اول۔ صفحہ ۵۹۔

[4] مصحف سجستانی۔

کردیا جائے۔

خلیفہ کے دستور اور حکم سے قاری اصحاب (جو پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب ہونے کے علاوہ قاری بھی تھے) کی ایک جماعت نے زید بن ثابت کی براہ راست نگرانی میں قرآنی سورتوں اور آیات کو جو تختیوں، پتوں اور ہڈیوں پر لکھی ہوئی تھیں اور پیغمبر اکرمؐ کے خانۂ مبارک میں موجود تھیں یا قاری اصحاب کے پاس تھیں، ان کو جمع کر کے ایک مصحف (جلد) میں محفوظ کر لیا اور اس کے مختلف نسخے ہر طرف بھیج دیئے۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد خلیفہ سوم[1] کے زمانے میں خلیفہ کو اطلاع دی گئی کہ لوگوں میں سہل انگاری، نسخوں میں تغیر و تبدل اور قرائت قرآن میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس طرح کتاب خدا کو تحریف اور تبدیل کرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

خلیفہ نے اس طریقے کو روکنے اور خطرے کے پیش نظر حکم دیا کہ وہ مصحف جو سب سے پہلے خلیفۂ اول کے حکم سے تیار ہوا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کی زوجہ حفصہ اور دوسرے خلیفہ کی بیٹی کے پاس امانت کے طور پر رکھا گیا تھا، پانچ قاری اصحاب کو جن میں زید بن ثابت بھی تھے ان کی نگرانی میں مامور کیا گیا کہ اس مصحف سے کئی نسخے تیار کئے جائیں اور ان کو اصل نسخے کے مطابق کر کے حکم دیا گیا کہ ان قرآنی نسخوں کو دوسرے صوبوں میں لوگوں تک پہنچایا جائے اور اسی طرح وہ نسخے جو لوگوں کے پاس موجود تھے ان سب کو جمع کر کے مدینہ بھیجا جائے۔ ان قرآنی نسخوں کو جو مدینے بھیجے جاتے خلیفہ کے حکم سے جلا دیا جاتا (یا بعض مورخوں کے قول کے مطابق ان کو ابلتے پانی میں ڈال دیا جاتا تھا)

آخر کار چند نسخے تیار ہو گئے کہ ان میں سے ایک مدینہ میں رکھا گیا، دوسرا مکہ میں، تیسرا شام میں، چوتھا کوفہ اور پانچواں بصرہ بھیجا گیا اور کہتے ہیں کہ ان پانچ نسخوں کے علاوہ بھی ایک یمن اور دوسرا بحرین بھیجا گیا تھا۔ ان اصلی نسخوں کو "مصحفِ امام" کہتے ہیں اور تمام باقی نسخوں کی اصل یہی نسخے ہیں۔

پہلے مصحف اور ان تمام نسخوں کی ترتیب میں جو فرق ہے[2] وہ صرف یہ ہے کہ پہلے مصحف میں سورہ برأت، سورہ مئین میں رکھی گئی تھی اور سورہ انفال بھی سورہ مثانی کے اندر تھی اور مصحف امام میں سورۂ انفال اور سورہ برأت کو سورہ اعراف اور سورہ یونس میں یکجا کر دیا گیا تھا۔

---

[1] اتقان جلد اول صفحہ ۶۱۔
[2] اتقان جلد اول صفحہ ۶۲۔

۸۔ قرآن کے بارے میں مسلمانوں کا اہتمام

جیساکہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے قرآن مجید کو جمع کرنے کے زمانے میں پہلی اور دوسری بار قرآنی سورتیں اور آیات مسلمان عوام الناس کے ہاتھ میں پہنچی تھیں اور وہ ان کی حفاظت کے لئے بہت کوشش اور جدوجہد کرتے تھے، اس کے علاوہ صحابہ اور تابعین کی وہ جماعت جو قرآن کی قاری تھی اور اس کے علاوہ ان کو کوئی اور کام ہی نہ تھا، قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا کام سب کے سامنے انجام دیتے تھے۔ جو نسخے تیار ہوئے تھے ان کو عوام کی دسترس میں رکھا گیا اور لوگوں نے اس کو قبول کر لیا، پھر ان نسخوں سے دوسرے نسخے تیار کئے گئے لیکن اس امر میں کسی قسم کا اعتراض نہ کیا گیا۔

حتیٰ کہ عثمانی جمع قرآن (دوسری بار جمع شدہ قرآن) میں چاہتے تھے کہ آیہ کریمہ: وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ (سورہ توبہ آیہ ۳۴) کو مصحف میں واؤ کے بغیر لکھیں تو اس کی روک تھام عمل میں آئی اور ابی بن کعب، پیغمبر اکرمؐ کے صحابی نے دھمکی دی اور قسم کھائی کہ اگر واؤ کو ہٹا دیں گے تو وہ نیام سے شمشیر نکال ان سے جنگ کرے گا۔ اور آخر کار واؤ کو لکھ دیا گیا۔

دوسرے خلیفہ نے اپنی خلافت کے دوران ایک فقرہ: "وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ" کو آیۂ شریفہ: وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ (سورہ توبہ آیہ ۱۰۰) میں بغیر واؤ عطف کے پڑھا تھا تو لوگوں نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا یہاں تک کہ خلیفہ کو مجبور کر دیا کہ اس فقرے کو واؤ کے ساتھ پڑھا جائے۔

حضرت علیؑ نے اگرچہ اس جمع آوری سے پہلے قرآن مجید کو نزولی ترتیب سے جمع کر دیا تھا اور لوگوں کو دکھا بھی دیا تھا لیکن اس کو قبول نہ کیا گیا۔ ان کو پہلی اور دوسری بار قرآن جمع کرنے میں بھی شریک نہیں کیا گیا مگر اس کے باوجود انہوں نے کسی قسم کی مخالفت اور مقاومت نہ کی اور رائج مصحف کو قبول کر لیا۔ پھر جب تک آپ زندہ رہے اور حتیٰ کہ اپنی خلافت کے دوران انہوں نے مخالفت نہیں کی۔

اسی طرح آئمہ اہلبیتؑ نے جو حضرت علیؑ کے جانشین اور فرزند ہیں انہوں نے بھی قرآن مجید کے اعتبار میں حتیٰ کہ اپنے خاص شیعوں کے سامنے بھی کبھی مخالفت کا اظہار نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے بیانات میں اس سے استفادہ کرتے رہے

اور اپنے ماننے والوں کو یہی تلقین کرتے آئے کہ عوامی قرأت کی پیروی کریں[1]۔ لہٰذا جرأت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عام مصحف حضرت علیؑ کے مرتب کئے ہوئے نسخے سے مختلف تھا پھر بھی ان کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ اہلبیتؑ کے ذوق میں قرآن سے قرآن کی تفسیر معتبر ہے اور اس طریقے میں سورتوں اور مکّی و مدنی آیات کی ترتیب میں قرآن کے اعلیٰ مقاصد کی رُو سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ہر آیہ کریمہ کی تفسیر میں مجموعی طور پر آیات کو مدّنظر رکھنا چاہئے کیونکہ وہ کلام جو عالمی اور دائمی ہو اس کے مجموعی مقاصد اور مطالب میں زمان و مکان، اسباب نزول اور واقعات نزول مؤثر نہیں ہو سکتے۔

ہاں، تو ان خصوصیات کے جاننے میں بہت سے فوائد ہیں مثلاً معارف و احکام اور چھوٹے قصص کی تاریخ پیدائش کا ظاہر ہونا جو نزول کے وقت وقوع پذیر ہوئے ہیں اور اسلامی دعوت نے کیسے ترقی کی۔ مثلاً حضرت رسول اکرمؐ کی تئیس ۲۳ سالہ بعثت کے زمانے میں کیا کیا واقعات رونما ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ حالات واضح ہو جاتے ہیں۔

لیکن وحدتِ اسلامی کو محفوظ رکھنا (جو آئمہ اہلبیتؑ کا اصلی و ہمیشہ مقصد رہا ہے) ان تمام فوائد سے بہت ہی اہم ہے۔

۹۔ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے

قرآن مجید کی تاریخ اپنے نزول کے دن سے لے کر آج تک مکمل طور پر واضح ہے، ہمیشہ قرآنی آیات اور سورتیں مسلمانوں کے وردِ زبان رہی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ پھرتی رہی ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ جو قرآن آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اکرمؐ پر بتدریج نازل ہوا تھا۔

لہٰذا قرآن مجید اپنے اعتبار، ثبوت اور واقعیت کے لحاظ سے کسی تاریخ کا محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ

---

[1] وافی، جلد اوّل، صفحہ ۲۷۳ - باب اختلاف القرآن۔

اس کتاب کی تاریخ بھی واضح ہے کیونکہ وہ کتاب جو دعویٰ کرتی ہے کہ خدا کا کلام ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنے ہی متن سے دلائل فراہم کرتی ہے اور جنّوں اور انسانوں کو چیلنج کرتی ہے کہ وہ سب مل کر بھی ایسا کلام لانے سے عاجز ہیں تو پھر اس بات کا ثبوت لانے کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس میں کسی قسم کی تحریف اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اور جیسا کہ خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا آج بھی بالکل ویسا ہی ہے وغیرہ، کیونکہ وہ خود اپنی دلیل اور ثبوت ہے، لہٰذا اس کلام کے ثبوت یا تصدیق اور تائید کے لئے کسی شخص کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس بات کی واضح ترین دلیل کہ وہ قرآن جو آج ہمارے پاس موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوا تھا، اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا تحریف وقوع پذیر نہیں ہوئی، یہ ہے کہ وہ اوصاف اور صفات جو قرآن مجید اپنے بارے میں بیان کرتا ہے وہ ابھی تک باقی ہیں اور جیسے پہلے تھے اب بھی ویسے ہی ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے: "میں نور اور ہدایت والی کتاب ہوں اور انسان کو حق و حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہوں"۔ فرماتا ہے: "میں خدا کا کلام ہوں اور اگر تم کہتے ہو کہ یہ کلام خدا کے بغیر کسی اور کا کلام ہے تو تمام جن و انس جمع ہو جائیں اور ایسا کلام لائیں یا پیغمبر اکرمؐ جیسے شخص کی مانند جو اُمّی ہو اور جس نے لکھنا پڑھنا بھی نہ سیکھا ہو اور جاہلیت کے ماحول میں یتیمی کی زندگی بسر کرتا رہا ہو، جس کا کوئی مربّی اور تربیت کرنے والا نہ تھا، اس جیسی کتاب لائیں اور یا اس کتاب کے اندر ایک شخص کے کلام کی طرح اختلاف اور تفاوت یا اسلوبِ نگارش، معارف اور احکام میں ذرّہ بھی فرق نکال کر دکھائیں"۔

قرآن مجید میں یہ اوصاف اور امتیازات اپنی جگہ پر باقی ہیں لیکن وہ رہنمائی جو قرآن مجید حق و حقیقت کی طرف کرتا ہے یہی وہ موجودہ جو ہماری دسترس میں ہے اپنے بہترین بیان کے ساتھ ایک مکمل جہان بینی جو دقیق ترین عقلی دلائل کے مطابق ہے اور سعادت مندانہ انسانی زندگی کی اہم ترین پائگاہ ہے، اس کو واضح کرتا ہے اور بڑی خیر اندیشی اور عاقبت اندیشی سے لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔

لیکن انسانی زندگی کی تمام ضروریات کو قرآن مجید اپنی حقیقت بینی کے ساتھ دو جہان کے خدا کی وحدت (توحید) کو اصلی بنیاد قرار دے کر تمام نکات سے بھی غفلت نہیں کرتا۔

اس کے بعد ان میں سے انسانی اخلاقِ فاضلہ کے بارے میں نتائج اخذ کرکے ان کی وضاحت شروع کرتا ہے۔
اس کے بعد انسان کے اجتماعی اور انفرادی اعمال و افعال بیان کرتا ہے جس چیز پر انسانی فطرت اور آفرینش منحصر ہے۔ تمام انسانی فرائض کو یک بیک بیان کرتا ہے اور ان کے جزئیات کی وضاحت پیغمبر اکرمؐ پر چھوڑ دیتا ہے۔
اس مجموعی کتاب اور سنّت سے وسیع دینِ اسلام بڑی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ وہ دین جو تمام انسانوں کی معاشرتی اور انفرادی انسانی زندگی کی تمام جہات کو گہری نظر سے ہمیشہ کے لئے تعیین کرکے مثبت حکم صادر کرتا ہے، وہ بھی اجزاء اور مواد کے درمیان بغیر کسی تضاد یا تردید کے۔
یہ ایسا دین ہے جس میں صرف مسائل کی فہرست کا تصوّر بھی دنیا کے بڑے بڑے قانون دانوں کی طاقت سے باہر ہے۔ اگرچہ وہ تمام زندگی اس کام پر صرف کریں۔
لیکن قرآنِ مجید کا اعجاز (معجزہ) خود اس کے اپنے بیان کے مطابق، اگرچہ قرآن مجید کا اسلوب بیان عربی زبان کے فصاحت و بلاغت کے زمانے اور فصیح لہجے سے متعلق ہے جو تاریخ السنہ میں "قطعہ مشتشی" (زرّیں یا درخشاں دور) کے نام سے مشہور ہے، اور صرف عرب قوم اور ملک سے مخصوص تھا اور یہ لہجہ فتوحاتِ اسلامی کے دوران جو پہلی صدی ہجری میں انجام پائیں، عربی زبان کی دوسری زبانوں سے آمیزش کے باعث ختم ہوگیا۔ آج وہ لہجۂ تخاطب عربی (کلامی لہجہ) دوسری تمام زبانوں کی طرح اپنے اصلی لہجے سے بہت دور اور بیگانہ ہوچکا ہے۔
لیکن قرآنِ مجید اپنے اسلوب بیان یا الفاظ کے لحاظ سے ہی چیلنج نہیں کرتا بلکہ معنوی لحاظ سے بھی، نقطی اور بیانی اسلوب کی طرح چیلنج کرتا ہے، اور اپنے آپ کو معجزہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔
بہرحال جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں یا اس زبان کی نظم و نثر لکھتے یا پڑھتے ہیں ان کے لئے ہرگز شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قرآن مجید کا لہجہ بہت ہی رس بھرا، میٹھا اور دلکش ہے جو انسانی ہوش و فہم کو اپنی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے حیران کردیتا ہے اور زبان اس کی تعریف سے قاصر ہے۔ یہ لہجہ نہ تو شعر ہے اور نہ ہی نثر بلکہ ایک ایسا اسلوبِ نگارش ہے جو دونوں قسموں سے بالکل الگ ہے جس میں شعر سے زیادہ کشش اور نثر سے زیادہ سلاست و روانی موجود ہے۔ قرآن کی ایک آیت یا ایک فقرہ جو فصیح و بلیغ خطیبوں یا فصیحوں یا ادیبوں کی انشاء میں آج نظر آتا ہے یہ ایسے چراغ کی طرح ہے جو تاریک شبستان میں رکھا گیا ہو اور اس شبستان کو روشن کردیتا ہے۔

غیر لفظی یا معنوی لحاظ سے بھی قرآن کا معجزہ بالکل اسی طرح ہے، بہت وسیع، اخلاقی اور اعتقادی معارف کی تنظیم اور ایسے ہی اسلام کے انفرادی و اجتماعی، عملی قوانین جن کے کلیات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جس کو کسی قسم کا خدشہ اور خطرہ نہیں اور وہ تضاد و تناقض سے پاک ہے جو ایک انسان کے بس کی بات نہیں خصوصاً اس شخص سے جو پیغمبر اکرمؐ کی زندگی جیسی شرائط میں رہا ہو۔

ایسے ہی قرآن کی مانند ایک کتاب کا نزول جو یکساں اور متشابہ الاجزاء ہو اور تئیس۲۳ سال کے عرصے میں حالات و شرائط میں بہت زیادہ اختلافات کے باوجود، جن میں خوشحالی، بیہودی سختی، ڈر، خوف، بدامنی، جنگ و صلح، خلوت و تنہائی، ہجوم و اژدہام، سفر و حضر وغیرہ میں سورت سورت اور آیت آیت کی صورت میں کسی اختلاف کے بغیر نازل ہوتا رہے، بہت ہی مشکل بلکہ محال ہے۔

المختصر وہ تمام اوصاف جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والے اس قرآن مجید میں موجود تھے، اس قرآن میں موجود ہیں پس قرآن مجید میں کسی قسم کی تبدیلی یا تحریف پیدا نہیں ہوئی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید کی حفاظت اور نگہبانی کا ذمہ اٹھایا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ○ (سورہ حجر آیہ ۹) ترجمہ: بیشک ہم نے خود اس قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کے نگہبان اور محافظ ہیں۔

اور پھر فرماتا ہے: وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ○ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ○ (سورہ حم سجدہ آیہ ۴۲) ترجمہ: بلاشک یہ ذکر (قرآن مجید) ایسی کتاب ہے جس کو ہرگز کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس میں کسی قسم کی فضول اور لغو باتیں راہ نہیں پا سکتیں، نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے اور یہ کتاب خدائے حکیم و دانا اور قابل تعریف کی طرف سے نازل ہوئی ہے"

ان آیات کے مطابق قرآن مجید اور خصوصاً اس لئے کہ یہ کتاب خدا کی یاد دہانی اور معارف حقہ کی طرف رہنما اور ہادی ہے، خدائی حفاظت کے تحت ہرگز نہ، نقصان اور تباہی سے محفوظ اور خدا کی پناہ میں ہے۔

اس خدائی وعدے کے باعث (آیۂ حفظ القرآن) جبکہ قرآن کے نزول سے چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور لاکھوں اور کروڑوں دشمنوں کے باوجود، بالکل محفوظ ہے اور ہر قسم کی دست درازی سے پاک رہا ہے اور یہ اکیلی

آسمانی کتاب ہے جو بڑی حفاظت اور معصومیت سے انسانوں کے پاس موجود ہے۔

۱۰ — قرآن مجید کی قرأت حفظ اور روایت

جیسا کہ پہلے چند بار اشارہ کیا گیا ہے رسول اکرمؐ کی زندگی ہی میں ہی ایک جماعت مدینہ میں وجود میں آچکی تھی جو قرآن کی تعلیم و تعلّم اور قرأت میں ہمیشہ مشغول رہتی تھی اور قرآنی آیات جو بتدریج نازل ہوتی تھیں پیغمبر اکرمؐ سے سن کر ان کو یاد کرتی اور کبھی کبھی خود آنحضرتؐ کے سامنے پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔

ایک گروہ قرأت کی تعلیم دینے پر مامور تھا اور جو لوگ ان سے پڑھا کرتے تھے وہ قرأت کی حالت کو روایت کی شکل میں اپنے استاد سے منسوب کرتے تھے اور اکثر طور پر جس چیز کو پڑھا کرتے اس کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔

فطری بات ہے کہ اس زمانے کے حالات بھی اس طرح کی حفظ و روایت کی اجازت دیتے تھے، کیونکہ ایک طرف وہ خط جو کتابت کے لئے رائج تھا اور استعمال کیا جاتا تھا وہ "خطِ کوفی" تھا جس میں نقطے اور اعراب (زبر، زیر، پیش) نہیں تھے اور ہر لفظ کو بڑی مشکل اور دقّت سے پڑھا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف عام ان پڑھ لوگ تھے۔ لہٰذا قرآن کے حفظ و روایت کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا، پھر یہی طریقہ سنّت بن گیا اور مستقبل کے لئے یادگار رہ گیا۔

۱۱ — قاریوں کے طبقات

قاریوں کے طبقات میں سے پہلا طبقہ انہی صحابہ کرام کو شمار کیا جاتا ہے جو رسول اکرمؐ کے زمانے میں تعلیم و تعلّم میں مصروف تھے اور ان میں سے بعض نے پورے قرآن کو جمع کر لیا تھا۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا نام اُمِّ ورقہ بنتِ عبداللہ بن حارث تھا۔[1]

(قرآن مجید کو جمع کرنے سے مراد یہ ہے کہ جیسا کہ بعض کتابوں میں انصار میں سے چار افراد بعض میں پانچ،

---

[1] اتقان، جلد اوّل صفحہ ۷۴۔

بعض میں چھ اور بعض میں زیادہ سے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ لوگ قرآن کی تعلیم و تعلم اور حفظ کرنے میں مشغول رہتے تھے، نہ کہ قرآن کو سورتوں اور آیتوں کی ترتیب سے ایک جگہ (جلد) میں جمع کرتا تھا، ورنہ خلیفۂ اوّل اور خلیفۂ دوم کے عہدِ خلافت میں پورے قرآن کو جمع کرنے کا کوئی مقصد ہی نہ ہوتا۔

اور اسی طرح جیساکہ بعض روایات میں آیا ہے کہ قرآن مجید کی تمام سورتوں اور آیتوں کی جگہ خود پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے معین اور مشخص ہو چکی تھی، یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق دوسری روایات یا بالکل خاموش ہیں یا اس کی تردید کرتی ہیں)

جیساکہ بعض علماء نے کہا ہے، اس طبقے میں سے چند ایک قرآن کی قرأت اور تعلیم کیلئے مشہور تھے، وہ تھے حضرت عثمان، حضرت علیؑ، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابو موسیٰ اشعری۔

<u>دوسرا طبقہ</u>: یہ طبقہ پہلے طبقے کے شاگردوں پر منحصر ہے کہ عموماً تابعین میں سے تھے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور وہ لوگ تھے جو مکہ اور مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام میں قرأت کے مدارس میں قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ البتہ یہ پانچ شہر ایسی جگہیں تھیں جن میں عثمانی قرآن (جو حضرت عثمان نے مرتب کیا تھا) موجود تھا۔

شہر مکہ میں عبید بن عمیر، عطاء بن ابی رباح، طاؤس، مجاہد، عکرمہ اور ابن ابی ملیکہ وغیرہ موجود تھے مدینہ میں ابن مسیب، عروہ، سالم، عمر بن عبدالعزیز، سلیمان بن یسار، عطاء بن یسار، معاذ قاری، عبداللہ بن اعرج، ابن شہاب زہری، مسلم بن جندب اور زید بن اسلم تھے۔

کوفہ میں علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، عمرو بن شرجیل، حارث بن قیس، ربیع بن خثیم، عمرو بن میمون، ابو عبدالرحمٰن سلمی، زر بن حبیش، عبید نضلہ، سعید بن جبیر، نخعی اور شعبی تھے۔

بصرہ میں ابو عالیہ، ابو رجاء، نصر بن عاصم، یحییٰ بن یعمر، حسن بصری، ابن سیرین اور قتادہ تھے۔ شام میں مغیرہ بن ابی شہاب جو حضرت عثمان کے اصحاب میں سے تھے اور خلیفہ بن سعد جو حضرت ابو درداء صحابی کے دوستوں میں سے تھے۔

<u>تیسرا طبقہ</u>: یہ طبقہ تقریباً دوسری صدی ہجری کے پہلے نصف سے تعلق رکھتا ہے اس طبقے میں مشہور ترین

لہ اس فصل کی طبقہ بندی ویسی ہی ہے جیسے سیوطی نے کتاب اتقان میں ذکر کیا ہے۔ مندرجہ بالا حضرات کی سوانح عمریوں کے بارے میں مزید اطلاع کے لئے "کتب رجال و تراجم" کی طرف رجوع کیا جائے

آئمہ قرأت بھی تھے جنہوں نے دوسرے طبقے سے تعلیم حاصل کی تھی۔

مکہ میں عبداللہ بن کثیر (قراء سبعہ میں سے تھے) حمید ابن قیس اعرج اور محمد ابن ابی محیص تھے۔

مدینہ میں ابوجعفر یزید بن قعقاع، شیبہ بن نصاح اور نافع بن نعیم (قراء سبعہ میں سے تھے)

کوفہ میں یحییٰ بن وثاب، عاصم بن ابی النجود (قراء سبعہ میں سے تھے) سلیمان بن اعمش، حمزہ (قراء سبعہ میں سے تھے) اور کسائی (قراء سبعہ میں سے ایک) تھے۔

بصرہ میں عبداللہ بن ابی اسحٰق، عیسیٰ بن عمر، ابوعمر بن اعلاء (قراء سبعہ میں سے) عاصم جحدری اور یعقوب حضرمی۔

شام میں عبداللہ بن عامر (قراء سبعہ میں سے) عطیہ بن قیس کلابی، اسمٰعیل بن عبداللہ بن مہاجر، یحییٰ بن حارث اور شریح بن یزید حضرمی تھے۔

<u>چوتھا طبقہ</u>: یہ لوگ تیسرے طبقے کے شاگردوں اور راویوں میں سے تھے مثلاً ابن عیاش، حفص اور خلف وغیرہ جن کا ذکر آئندہ فصل میں آئے گا۔

<u>پانچواں طبقہ</u>: یہ طبقہ اہل بحث اور اہل تالیف پر مشتمل ہے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جس شخص[1] نے سب سے پہلے علم قرأت میں کتاب تالیف کی وہ ابوعبید بن قاسم بن سلام ہے۔ اس کے بعد احمد بن جبیر کوفی، اس کے بعد اسمٰعیل بن اسحٰق مالکی جو قالون راوی کے اصحاب میں سے تھے، پھر ابوجعفر ابن جریر طبری اور انکے بعد داجونی اور مجاہد۔

ان کے بعد بحث اور تحقیق کا دامن وسیع تر ہو گیا[2] دانی اور شاطبی نے نظم و نثر میں بے شمار رسائل اور کتب تالیف کیں۔

---

[1] ریحانہ، جلد دوم صفحہ ۱۴۱۔ حمزہ زیات کے ترجمے میں۔ اتقان جلد اوّل، صفحہ ۷۵۔

[2] دانی، ابوعمرو عثمان بن سعید اندلسی جو مشہور قاری تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ کتابیں لکھیں اور ۴۴۴ ہجری میں وفات پائی۔
شاطبی، جو قاریوں اور حفاظ قرآن مجید میں سے تھے، انہوں نے قصیدہ شاطبیہ لکھا جو علم قرأت میں ہے۔ صاحب کشف الظنون کے قول کے مطابق اس قصیدے کے ایک ہزار ایک سو بیس شعر ہیں۔ انہوں نے ۵۹۰ ہجری میں وفات پائی۔

۱۲ــــ قراءِ سبعہ (سات مشہور قاری)

تیسرے طبقے میں سے سات قاری عوام میں بہت ہی مشہور ہوئے جن کو مرجعیت کا مرتبہ حاصل اور انہوں نے دوسروں کو مات کر دیا تھا، اسی طرح ان کے راوی بھی اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے، ہر قاری کے لئے دو راوی متعین ہوئے تھے۔

قراءِ سبعہ اور ان کے راوی مندرجہ ذیل ہیں :۔

اوّل : ابن کثیر مکّی[1] ان کے راوی قنبل اور بزی ہیں۔

دوم : نافع مدنی[2] ان کے راوی قالون اور ورش ہیں۔

سوم : عاصم کوفی[3] ان کے راوی ابوبکر شعبۃ بن عیاش اور حفص ہیں۔ موجودہ قرآنی قرأت جو عوام کے د
رائج ہے، عاصم کوفی کی ہی قرأت کے مطابق ہے (حفص کی روایت)

چہارم : حمزہ کوفی[4] ان کے راوی خلف اور خلاد ہیں (ایک واسطے سے)

---

[1] عبداللہ ابن کثیر مکّی، انہوں نے علم قرأت کو عبداللہ بن صائب اور مجاہد سے سیکھا، اور انہوں نے ابن عباس سے۔ ابن نے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے۔ عبداللہ ابن کثیر مکی نے ۱۲۰ھ کو مکہ میں فوت ہوئے۔

[2] نافع بن عبدالرحمٰن بن نعیم اصفہانی مدنی۔ انہوں نے علم قرأت یزید بن قعقاع قاری اور ابو میمونہ سے جو ام سلمہ ام المومنین کا غلا سیکھا تھا۔ ۱۵۹ یا ۱۶۹ھ میں شہر مدینہ میں فوت ہوئے۔

[3] عاصم بن ابی النجود کوفی جو بنی خذیمہ کے غلام تھے انہوں نے علم قرأت کو ابو عبدالرحمٰن سلمی سے سیکھا، اور سلمی نے امیر المومنین سے۔ ان کے علاوہ انہوں نے علم قرأت سعد بن ایاس شیبانی اور زر بن حبیش سے بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۲۷ یا ۱۲۹ھ کو کوفہ میں فوت ہوئے

[4] حمزہ بن حبیب زیات تمیمی کوفی فقیہ اور قاری تھے۔ انہوں نے قرأت قرآن کو عاصم، اعمش، سبیعی، منصور بن معتمر اد ہیں شیعوں کے چھٹے امام (جعفر صادق ؑ) سے سیکھا اور امام جعفر صادق کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ کتابیں ہیں۔ آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "متشابہ القرآن" لکھی۔ ۱۵۶ھ میں وفات پائی۔

پنجم : کسائی کوفی[1]۔ ان کے راویوں میں سے دوری اور ابوالحارث ہیں۔

ششم : ابوعمرو بن علاء بصری[2]۔ ان کے راوی دوری اور سوسی ہیں (ایک واسطے سے)

ہفتم : ابن عامر[3]۔ ان کے راوی ہشام[4] اور ابن ذکوان ہیں (ایک واسطے سے)

بعد میں آنے والے قرائاتِ سبعہ ہیں سے اور قرأت میں شہرت کے لحاظ سے قراءِ ثلاثہ مشہور ہیں۔ ان کے نام ابوجعفر[5]، یعقوب[6] اور خلف[7] ہیں۔

ان کے علاوہ اور قرائتیں بھی بیان ہوئی ہیں مثلاً ایسی قرائتیں جو اصحابِ رسول اللہ سے متفرقہ طور پر ہم تک پہنچی ہیں اور اسی طرح وہ قرائتیں جو شاذ و نادر ہیں لیکن ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ایسے ہی وہ

---

[1] علی بن حمزہ بن عبداللہ بن فیروز فارسی کوفی بغدادی جو نحو اور قرأت کے اماموں میں سے ہیں، وہ دو عباسی خلفاء امین اور مامون کے ادبی معلم اور استاد بھی تھے۔ انہوں نے علم نحو یونس نحوی اور خلیل بن احمد نحوی عروضی سے پڑھا اور علم قرأت کو حمزہ اور شعبہ بن عیاش سے حاصل کیا وہ ۱۷۹ یا ۱۹۳ھ میں ہارون الرشید خلیفہ عباسی کے ہمراہ طوس آئے اور شہر رے (موجودہ تہران) میں فوت ہوئے۔

[2] ابوعمر زبّان (با فتح زا و تشدید با) بن علا بصری بغدادی اپنے زمانے کے مشہور ترین علمائے ادب اور قرأت کے استادوں میں سے تھے۔ انہوں نے علم قرأت کو تابعین سے سیکھا اور ۱۵۴ یا ۱۵۹ھ کو کوفہ میں فوت ہوئے۔

[3] عبداللہ بن عامر شافعی دمشقی۔ انہوں نے علم قرأت ابو درداء صحابی اور حضرت عثمان کے اصحاب سے سیکھا۔ ۱۱۸ھ کو دمشق میں وفات پائی۔

[4] ہر قاری کے راویوں کے بارے میں اختلاف ضرور موجود ہے، اس کتاب میں جیسا کہ لکھا گیا ہے اتقان کے مطابق ہے۔

[5] ابوجعفر یزید بن قعقاع مدنی۔ یہ ام المومنین ام سلمہ کے غلاموں میں سے تھے، انہوں نے علم قرأت کو عبداللہ بن عیاش مخزومی، ابن عباس، اور ابی ہریرہ سے سیکھا اور اصحاب سے رسول اکرمؐ سے سیکھا تھا۔ ۱۲۸ یا ۱۳۲ھ میں مدینہ میں فوت ہوئے۔

[6] یعقوب بن اسحاق بصری حضرمی۔ آئمہ فقہ میں سے اور ادبیات کے استاد تھے۔ قرأت کو سلام بن سلیمان سے سیکھا۔ سلیمان نے عاصم سے اور عاصم نے سلمی سے اور سلمی نے حضرت علیؑ سے سیکھا تھا۔ ۲۰۵ھ میں فوت ہوئے۔

[7] خلف بن ہشام بزاز جو آئمہ قرأت میں شمار ہوتے تھے۔ آپ قرأت میں حمزہ کے راوی بھی۔ قرأت کو مالک بن انس، حماد بن زید اور ابو عوانہ سے حاصل کیا۔ ۲۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

متفرقہ قرائتیں بھی ہیں جو آئمہ اہلبیتؑ[1] سے روایت ہوئی ہیں لیکن دوسری روائتیں بھی ان سے حاصل ہوئی ہیں جو پہلی سے اہم تر اور مشہور تر ہیں ۔

عام علماء کی رائے ہے "قرائات سبع" (سات قسم کی مشہور قرأتوں) کو متواتر کہا جاتا ہے اور حتی کہ ایک جماعت مشہور حدیث نبوی نزل القرآن علی سبعه احرف[1] ۔ ترجمہ: قرآن کریم سات قسم کے حروف کے مطابق نازل ہوا ہے ۔ کے مطابق اس حدیث کو سات قسم کی قرأتوں سے تعبیر و تفسیر کرتے ہیں یعنی قرائاتِ سبع (سات قسم کی قرأتیں) مشہور ہیں نہ کہ متواتر۔

زرکشی[2] اپنی کتاب برہان میں کہتے ہیں : "حقیقت یہ ہے کہ یہ سات قسم کی قرأتیں قراء سبعہ سے مسلسل طور پر ہم تک پہنچی ہیں لیکن ان کا تسلسل پیغمبر اکرمؐ سے قابلِ تامل اور قابلِ تردید ہے کیونکہ قراء سبعہ کی اسناد ان قرأتوں کے ساتھ کتاب قرأت میں موجود ہیں اور یہ سب اسناد ایک فرد سے دوسرے فرد کے طور پر نقل ہوئی ہیں۔

مکی[3] اپنی کتاب میں کہتے ہیں : جس شخص کو یہ گمان ہو کہ ان قاریوں کی قرأتیں نافع اور عاصم کی طرح سات حروف پر مشتمل ہیں، جیسا کہ حدیث نبوی میں آیا ہے تو اس شخص نے سخت غلطی کی ہے ۔ اس گمان کا لازمہ یہ ہے کہ ان سات قسم کی قرأتوں کے پیشواؤں کے علاوہ قرآن کی قرأت موجود ہی نہیں ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ قدیم علماء نے قرأتوں کو جمع اور مرتب کر کے کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابو عبید قاسم بن سلام، ابو حاتم سجستانی، ابو جعفر طبری اور اسمٰعیل قاضی نے ان سات قاریوں سے چند گنا زیادہ قاریوں کے نام گنوائے ہیں ۔

۲۰۰ ھ کے لگ بھگ بصرہ میں عوام میں ابو عمرو یعقوب کی قرأت رائج تھی ۔ بہت زیادہ مدت اسی قرأت پر گزری یہاں تک کہ ۳۰۰ ھ کے لگ بھگ ابن مجاہد نے یعقوب کا نام ہٹا کر کسائی کا نام اس کی جگہ لکھ دیا ۔

عوام نے قراء سبعہ کی مانند دوسرے قاریوں یا حتیٰ کہ ان سے بہتر قاریوں کی طرف توجہ نہیں کی اور قراء سبعہ

---

[1] بحار جلد قرآن و صافی اور مقدمہ تفسیر وغیرہ میں اور سیوطی نے اتقان جلد اول صفحہ ۴۷ میں اس روایت کو ۲۱ اصحاب سے نقل کیا ہے اور تسلسل کے دعوے کو اس سے منسوب کیا ہے ۔

[2] اتقان جلد اول صفحہ ۸۲ ۔ [3] اتقان جلد ۲ صفحہ ۸۲ ۔

کو ہی قابلِ توجہ سمجھتے تھے۔ اس کا باعث یہ تھا کہ ان اماموں کے راوی بہت زیادہ تھے لہٰذا ان تمام راویوں کی قرأتوں کو حفظ کر کے رواج دینے کا یارا نہیں تھا۔ اس لئے یہ طے پایا کہ ان افراد سے جن کی قرأت مصحف (قرآن) کے رسم الخط کے مطابق ہو اور ان کا ضبط اور حفظ کرنا آسان ہو ان کو انتخاب کیا جائے۔

اس کی رُو سے مصحفوں (قرآنی نسخوں) کی تعداد کے مطابق جو صرف پانچ تھے اور حضرت عثمان نے مکّہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ اور شام بھیجے تھے۔ ان پانچ شہروں سے پانچ قاری انتخاب کر کے انکی قرأت کو رائج کیا جائے۔

جیساکہ ابن جبیر نے مجاہد کی طرح اپنی کتاب میں جو قرأتوں کے بارے میں لکھی تھی، بیان کیا کہ قراءِ سبعہ میں سے صرف پانچ افراد کو پانچ شہروں سے انتخاب کیا گیا۔

اس کے بعد ابنِ مجاہد اور دوسروں نے ایک اور بیان دیا ہے کہ جس کے مطابق حضرت عثمان نے دو مصحفوں (قرآنی نسخوں) کو یمن اور بحرین بھیجا تھا (اور عثمانی نسخوں کی تعداد سات تک پہنچ گئی تھی) اس کے باعث سات قاری انتخاب کئے گئے۔

لیکن چونکہ یمن اور بحرین بھیجے جانے والے قرآنی نسخوں کے بارے میں صحیح خبر اور روایت ہمارے پاس موجود نہیں، کوفہ کے قاریوں میں سے انتخاب کر کے پہلے پانچ قاریوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح قاریوں کی تعداد سات ہو گئی۔

دوسری طرف اتفاق سے یہ عدد حدیثِ نبوی میں آنے والے عدد انزل القرآن علی سبعہ احرف سے مطابقت کرتا تھا اور اس واقعے سے اکثر لوگ بے خبر تھے لہٰذا مجبوراً انہوں نے خیال کیا کہ پیغمبر اکرمؐ کا مقصد ان سات حروف سے انہی سات قسم کی قرأتوں سے ہے۔

بہر حال وہی قرأت قابلِ اعتماد ہے جس کی صحیح سند و روایت عربی قواعد کے مطابق اور قرآنی رسم الخط کے عین مطابق ہو۔ (مکّی کا کلام یہاں ختم ہو جاتا ہے)

قرابؔ[1] نے کتاب مثانی میں لکھا ہے: "یہ بات کہ تمام قاریوں میں سے صرف سات قاریوں کی پیروی کی

---

[1] اتقان۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۸۳۔

جائے اور دوسروں کی نہیں"۔ اس میں نہ تو کسی قسم کا اثر ہے اور نہ ہی سنت ہے، بلکہ بعض متأخرین نے ان سات قسم کی قرأتوں کو جمع کر کے شائع اور رائج کیا ہے۔ اس وقت یہ گمان ہوا کہ ان کے علاوہ کسی اور طریقے سے قرآن مجید کو نہیں پڑھا جا سکتا، حالانکہ کسی شخص نے ایسی بات نہیں کہی ہے۔

۱۳۔ قرآنی آیات کی تعداد

قرآنی آیات کی تعداد پیغمبر اکرمؐ کے زمانے تک پہنچتی ہے اور آنحضرتؐ کی احادیث میں آیات کے اعداد کا ذکر ہوا ہے مثلاً "سورہ آلِ عمران میں سے دس آیتیں"۔ حتیٰ کہ بعض سورتوں کی آیات کا گننا بھی پیغمبر اکرمؐ سے منسوب ہوا ہے، مثلاً "سورہ حمد[1] کی سات آیات ہیں اور سورہ ملک[2] کی تیس آیتیں ہیں"۔

مجموعی طور پر قرآنی آیات کی تعداد کے بارے میں جیسا کہ ابو عمرو[3] دانی سے منقول ہے، چھ اقوال ہیں:

بعض نے کہا ہے کہ قرآن مجید کی کل آیات کی تعداد چھ ہزار (۶۰۰۰) ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چھ ہزار دو سو چار آیات (۶۲۰۴) ہیں۔ پھر کہا گیا کہ چھ ہزار دو سو چودہ (۶۲۱۴) ہیں۔ ایک بار کہا گیا کہ چھ ہزار دو سو انّیس (۶۲۱۹) ہیں اور دوسری بار کہا گیا کہ چھ ہزار دو سو پچیس (۶۲۲۵) ہیں۔ اس کے علاوہ ایک قول میں کہا گیا ہے کہ چھ ہزار دو سو چھتّیس (۶۲۳۶) ہیں۔

ان چھ اقوال میں سے دو اقوال اہل مدینہ کے قاریوں کے اور چار اقوال دوسرے شہروں کے قاریوں سے متعلق ہیں جن کے پاس مصحف عثمانی کے نسخے موجود تھے۔ یہ قاری مکہ، کوفہ، بصرہ اور شام سے تھے۔

ان اقوال کے لانے والوں میں سے ہر ایک نے اپنے عدد کو روائت کے ذریعے صحابہ کرام کے زمانے تک پہنچایا ہے اور پھر اس کو "روایتِ موقوفہ" کہہ کر پیغمبر اکرمؐ سے منسوب کیا ہے۔ اس لحاظ سے عوام بھی آیات کی تعداد اور ان کی تشخیص کو توفیقی جانتے ہیں۔ اہلِ مدینہ کے عدد[4]، دو ہیں، ایک تو ابی جعفر یزید بن قعقاع اور شیبۃ بن نصاح کا ہے،

---

[1] و [2] اتقان جلد اوّل، صفحہ ۶۸۔ [3] اتقان جلد اول صفحہ ۶۹۔

[4] کتاب اتقان جلد اول صفحہ ۶۹۔ ابو عبد اللہ موصلی سے نقل کیا گیا ہے۔

اور دوسرا اسمٰعیل بن جعفر بن ابی کثیر انصاری کا عدد ہے۔

اہلِ مکہ کا عدد ابن کثیر کا عدد ہے جو مجاہد نے ابن عباس سے اور انہوں نے ابی بن کعب سے روایت کی ہے

اہل کوفہ کا عدد حمزہ، کسائی اور خلف سے منسوب ہے اور اس کو حمزہ نے ابن ابی لیلیٰ سے، اس نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے اور اس نے حضرت علیؑ سے روایت کیا ہے۔

اہل بصرہ کا عدد عاصم بن عجاج جحدری کا عدد ہے۔

اہل شام کا عدد ابن ذکوان اور ہشام بن عمار کا عدد ہے اور اس کو ابو درداء سے منسوب کرتے ہیں۔

قرآن کی کل آیات کی تعداد میں اختلاف کا باعث یہ ہے کہ قرآنی سورتوں کی تعداد میں اختلاف ہے اور اسی طرح دوسرے شماریات جو قرآنی سورتوں کے حروف اور الفاظ کی تعداد کے متعلق ذکر کئے گئے ہیں کہ ان کا موضوع بالکل الگ ہے اور ہمارے لئے اہم نہیں ہے۔

۱۴۔ قرآنی سورتوں کے نام

قرآن مجید کو آیات میں تقسیم کرنے کا مسئلہ، اس کو سورتوں میں تقسیم کرنے کی طرح قرآنی بنیاد پر مبنی ہے، اور خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں چند بار ایک سورہ کا نام لیا ہے، جیسا کہ ایک آیت کا نام بھی لیا گیا ہے: سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا (سورہ نور آیہ ۱) وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ (سورہ توبہ آیہ ۸۶) اور فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (سورہ بقرہ آیہ ۲۳) اور ایسی ہی دوسری مثالیں موجود ہیں۔

سورہ کی وجہ تسمیہ کو کبھی تو اس سورت میں آنے والے نام یا موضوع جس کے بارے میں اس میں بحث کی گئی ہے رکھتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے، سورۂ بقرۃ، سورۂ آل عمران، سورہ اسرا (بنی اسرائیل) سورۂ توحید وغیرہ۔ ایسے ہی قدیم قرآنوں میں نظر آتا ہے کہ سورتوں کے آغاز میں لکھا کرتے تھے: تذکر فیها البقرة اور سورة یذکر فیها آل عمران وغیرہ۔

اور کبھی کبھی ایک فقرہ سورت کے شروع میں بیان کیا گیا ہے جو اس سورت کا تعارف کراتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے سورۃ اقراء باسم ربک، سورۃ انا انزلناہ اور سورۃ لم یکن وغیرہ۔

کبھی سورت میں آنے والی تعریف کے ساتھ اس کا تعارف کرایا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے: سورۃ فاتحۃ الکتاب[۱]، سورۃ ام الکتاب و سبع مثانی۔ سورۃ اخلاص[۲]۔ سورۃ نسبۃ الرب وغیرہ۔

یہ طریقے موجودہ آثار کی گواہی کے مطابق اوائل اسلام میں بھی رائج تھے اور حتی کہ احادیث نبوی میں بھی پیغمبر اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے قرآنی سورتوں کی وجہ تسمیہ نظر آتی ہے مثلاً سورۃ بقرہ، سورہ آلِ عمران، سورہ ہود، سورہ واقعہ وغیرہ۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناموں میں سے بہت زیادہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں کثرت الاستعمال کی وجہ سے متعین ہو چکے تھے۔ بہر حال ان کی شرعی حیثیت نہیں ہے (یعنی شریعت کے لحاظ سے ان ناموں کی کوئی پابندی نہیں ہے)

۱۵۔ قرآن مجید کا رسم الخط اور اعراب لگانا

قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد پہلی اور دوسری صدی ہجری میں خط کوفی میں لکھا جاتا تھا اور (جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے) خطِ کوفی مبہم ہونے کی وجہ سے حفظ، روایت اور قرأت جیسی تنظیم کا موجب ہوتا تھا بہر حال یہ مشکلات کلی طور پر عوام کے لئے حل نہیں ہوتی تھیں اور صرف حافظِ قرآن یا راوی ہی تھے جو قرآن مجید کے صحیح تلفظ سے آشنا تھے، ان کے بغیر جو بھی مصحفِ قرآن کو کھول کر پڑھتا تھا اس کے لئے قرآن کی قرأت آسان نہ تھی۔

اسی لحاظ سے پہلی صدی ہجری کے آخر پر "ابوالاسود دئلی[۳]" نے جو حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے

۱ے سورہ حمد چونکہ قرآن مجید کے آغاز میں رکھی گئی تھی اس لئے اس کو فاتحۃ الکتاب کہتے تھے، اور اس میں سات آیات کی وجہ سے سبع مثانی بھی کہا جاتا ہے۔

۲ے سورہ قل ھو اللہ چونکہ خالص توحید اور وحدت خدائی پر مشتمل ہے اس کو سورہ اخلاص کہا جاتا ہے اور چونکہ اس میں صرف خداوند تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے اس لئے اس کو نِسبَۃُ الرَّبّ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کے معنی خدا کی تعریف اور ستائش کرتے کے ہیں۔

۳ے الاتقان جلد دوم صفحہ ۱۷۱۔

اور دوسرا اسمٰعیل بن جعفر بن ابی کثیر انصاری کا عدد ہے۔

اہل مکہ کا عدد ابن کثیر کا عدد ہے جو مجاہد نے ابن عباس سے اور انہوں نے ابی بن کعب سے روایت کی ہے

اہل کوفہ کا عدد حمزہ، کسائی اور خلف سے منسوب ہے اور اس کو حمزہ نے ابن ابی لیلیٰ سے، اس نے ابو عبدالرحمن سلمی سے اور اس نے حضرت علیؑ سے روایت کیا ہے۔

اہل بصرہ کا عدد عاصم بن عجاج جحدری کا عدد ہے۔

اہل شام کا عدد ابن ذکوان اور ہشام بن عمار کا عدد ہے اور اس کو ابو درداء سے منسوب کرتے ہیں۔

قرآن کی کل آیات کی تعداد میں اختلاف کا باعث یہ ہے کہ قرآنی سورتوں کی تعداد میں اختلاف ہے اور اسی طرح دوسرے شماریات جو قرآنی سورتوں کے حروف اور الفاظ کی تعداد کے متعلق ذکر کئے گئے ہیں کہ ان کا موضوع بالکل الگ ہے اور ہمارے لئے اہم نہیں ہے۔

۱۴۔ قرآنی سورتوں کے نام

قرآن مجید کو آیات میں تقسیم کرنے کا مسئلہ، اس کو سورتوں میں تقسیم کرنے کی طرح قرآنی بنیاد پر مبنی ہے، اور خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں چند بار ایک سورہ کا نام لیا ہے، جیسا کہ ایک آیت کا نام بھی لیا گیا ہے: سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا (سورہ نور آیہ ۱) وَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ (سورہ توبہ آیہ ۸۶) اور فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (سورہ بقرہ آیہ ۲۳) اور ایسی ہی دوسری مثالیں موجود ہیں۔

سورہ کی وجہ تسمیہ کو کبھی تو اس سورت میں آنے والے نام یا موضوع جس کے بارے میں اس میں بحث کی گئی ہے رکھتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے، سورۂ بقرۃ، سورۂ آل عمران، سورہ اسرا (بنی اسرائیل) سورۂ توحید وغیرہ۔

ایسے ہی قدیم قرآنوں میں نظر آتا ہے کہ سورتوں کے آغاز میں لکھا کرتے تھے: تذکر فیھا البقرۃ اور سورۃ یذکر فیھا آل عمران وغیرہ۔

اور کبھی کبھی ایک فقرہ سورت کے شروع میں بیان کیا گیا ہے جو اس سورت کا تعارف کراتا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے سورۃ اقراء باسم ربک، سورۃ انا انزلناہ اور سورۃ لم یکن وغیرہ۔

کبھی سورت پر آنے والی تعریف کے ساتھ اس کا تعارف کرایا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے : سورۃ فاتحۃ الکتاب[1] ، سورۃ ام الکتاب و سبع مثانی۔ سورۃ اخلاص[2]۔ سورۃ نسبۃ الرب وغیرہ۔

یہ عرفیت موجودہ تاریخی گواہی کے مطابق اوائل اسلام میں بھی رائج تھے اور حتی کہ احادیث نبوی میں بھی پیغمبر اکرمؐ کی زبان مبارک سے قرآنی سورتوں کی وجہ تسمیہ نظر آتی ہے مثلاً سورۃ بقرہ ، سورہ آل عمران ، سورہ ہود ، سورۃ واقعہ وغیرہ۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناموں میں سے بہت زیادہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں کثرت استعمال کی وجہ سے متعین ہو چکے تھے۔ بہر حال ان کی شرعی حیثیت نہیں ہے (یعنی شریعت کے لحاظ سے ان ناموں کی کوئی پابندی نہیں ہے)

۵۔ قرآن مجید کا رسم الخط اور اعراب لگانا

قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد پہلی اور دوسری صدی ہجری میں خط کوفی میں لکھا جاتا تھا اور (جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے) خط کوفی مبہم ہونے کی وجہ سے حفظ، روایت اور قرأت جیسی تنظیم کا موجب ہوتا تھا بہر حال یہ مشکلات کلی طور پر عوام کے لئے حل نہیں ہوتی تھیں اور صرف حافظ قرآن یا راوی ہی تھے جو قرآن مجید کے صحیح تلفظ سے آشنا تھے، ان کے بغیر جو بھی مصحف قرآن کو کھول کر پڑھتا تھا اس کے لئے قرآن کی قرأت آسان نہ تھی۔

اسی لحاظ سے پہلی صدی ہجری کے آخر پر "ابو الاسود دوئلی"[3] نے جو حضرت علیؑ کے اصحاب میں سے تھے

۱؎ سورہ حمد چونکہ قرآن مجید کے آغاز میں رکھی گئی تھی اس لئے اس کو فاتحۃ الکتاب کہتے تھے، اور اس میں سات آیات کی وجہ سے سبع مثانی بھی کہا جاتا ہے۔

۲؎ سورہ قل ھو اللہ چونکہ خالص توحید اور وحدت خدائی پر مشتمل ہے اس کو سورہ اخلاص کہا جاتا ہے اور چونکہ اس میں صرف خداوند تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے اس لئے اس کو نسبۃ الرب بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کے معنی خدا کی تعریف اور ستائش کرتے کے ہیں

۳؎ اتقان جلد دوم صفحہ ۱۷۱۔

آپ کی رہنمائی میں عربی زبان کی گرامر لکھی تھی اور اموی خلیفہ عبدالملک کے حکم سے حروف پر نقطے لگانے کا کام شروع کیا تھا۔ اس طرح رسم الخط میں ابہام بہت حد تک رفع ہو گیا۔

لیکن پھر بھی یہ ابہام فی الجملہ (کلی طور پر) حل ہوتا تھا نہ بالجملہ (لفظ بلفظ اور فقرہ بہ فقرہ) یہاں تک کہ خلیل بن[1] احمد مشہور عالم نحو جنہوں نے علم عروض کو ایجاد کیا تھا، لفظی کیفیات اور حروف کی شکلیں بنائیں یعنی مدّ، شدّ، زبر، زیر، پیش، جزم، دو پیش ٌن، دو زیر نون، دو زیر نون، دو زبر نون، ردم، اشمام وغیرہ اور اس طرح یہ ابہام رفع ہو گیا۔

اس سے کچھ عرصہ[2] پہلے دو نقطوں کے ذریعے حروف کی حرکت سمجھی جاتی تھی یعنی حرف پر زبر کی بجائے اس پر نقطہ لگا دیتے تھے اور زیر کی بجائے حرف کے نیچے نقطہ لگاتے اور پیش کی بجائے حرف کے اوپر کونے پر نقطہ لگایا کرتے تھے اور یہ طریقہ کبھی کبھی زیادہ ابہام اور پیچیدگی کا باعث بن جاتا تھا۔

---

[1] اتقان، جلد دوم، صفحہ ۱۷۱ [2] اتقان، جلد دوم، صفحہ ۱۷۱۔

آپ کی رہنمائی میں عربی زبان کی گرامر لکھی تھی اور اموی خلیفہ عبدالملک کے حکم سے حروف پر نقطے لگانے کا کام شروع کیا تھا۔ اس طرح رسم الخط میں ابہام بہت حد تک رفع ہو گیا۔

لیکن پھر بھی یہ ابہام فی الجملہ (کلی طور پر) حل ہوتا تھا نہ بالجملہ (لفظ بلفظ اور فقرہ بہ فقرہ) یہاں تک کہ خلیل بن احمد[1] مشہور عالم نحو جنہوں نے علم عروض کو ایجاد کیا تھا، لفظی کیفیات اور حروف کی شکلیں بنائیں یعنی مدّ ، شدّ ، زبر ، زیر ، پیش ، جزم ، دو پیش "ن ، دو زبر نون ، دو زیر نون ، روم ، اشمال وغیرہ اور اس طرح یہ ابہام رفع ہو گیا۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے[2] دو نقطوں کے ذریعے حروف کی حرکت سمجھی جاتی تھی یعنی حرف پر زبر کی بجائے اس پر نقطہ لگا دیتے تھے اور زیر کی بجائے حرف کے نیچے نقطہ لگاتے اور پیش کی بجائے حرف کے اوپر کونے پر نقطہ لگایا کرتے تھے اور یہ طریقہ کبھی کبھی زیادہ ابہام اور پیچیدگی کا باعث بن جاتا تھا۔

---

[1] اتقان، جلد دوم، صفحہ ۱۷۱

[2] اتقان، جلد دوم، صفحہ ۱۷۱۔

تالیف:

علامہ محمد حسین طباطبائی

ترجمہ:

ڈاکٹر شاہد چوہدری

موسسہ مطالعات وتحقیقات فرہنگی

تہران ۱۹۸۳ء